

اجتہاد سے آگے

کرشن چندر

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی نمبر ۱

(جملہ حقوق محفوظ)

طبع اول

تین ہزار

۱۹۴۸ء

فیوض ستری نے قادی پریس نزد منزل، محمد علی روڈ بمبئی ملے سے چھپوا کر
کتب پیشہ زلمیڈ، ریل بڈنگ، پالو بند بمبئی سے شائع کیا۔

کہانیاں

۷	...	پورے چاند کی رات	۱
۲۲	...	خلل ہے دماغ کا	۲
۳۲	...	مغربی گھاٹ کی سیر	۳
۴۵	...	سیرا پچھ	۴
۵۴	...	انجیر	۵
۶۹	...	پھول سرخ ہیں	۶
۸۳	...	بت جاگتے ہیں	۷
۹۶	...	مرنے والے ساتھی کی مسکراہٹ	۸
۱۰۸	...	اجنبستاے آگے	۹
۱۴۶	جانور	۱۰

پورے پاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں۔ اور ہوا میں بریلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آگئی تھی، بلند بالا تنگوں کے نیچے مہلیں دوب پر کہیں کہیں برون کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا۔ اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام مکھراج کے نگینوں کی طرح بھلدا میں گے۔ اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے گہرا اور ہوتا جائے گا۔ اور اس جھیل کے پل کے پار پک ڈنڈی کی خاک ملائم بیٹروں کی جانی پچانی باا اسے بھیجنے آٹھے گی۔ اور پھر ان بلند

بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جموں سے سردیوں کی پٹی ہوئی موٹی
 موٹی گفٹ اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔
 لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا۔ ابھی تنگوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔
 ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگ ڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے
 گونجنے لگا تھا۔ ابھی محل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا
 گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا۔ جو بہار کی
 آمد پر یکایک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث منہسی کی طرح کھل جائیں گے۔
 پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شکوے فہ چکنے لگے تھے،
 اپریل زمستان کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں۔ اور بہار
 کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے
 ننھے شکارے سطح آب پر زلفیاں و لہزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔
 پل کے جنگلے کا ہمارا لے کر میں ایک عرصہ سے اس کا انتظار کر رہا تھا
 یہ پہر ختم ہو گئی۔ شام آگئی، جھیل در کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی سنگلاخی
 مہرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے، اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح
 کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے
 سے اُس کنارے تک پھیلتا گیا۔ اور قرمزی سے سرسئی اور سرسئی سے سیاہ
 ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگ ڈنڈی بھی سو گئی۔ اور
 پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارہ کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا
 کی خشکی تیز تر ہوتی گئی۔ اور ننتھے اس کے بریلے مس سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا۔

اور پھر وہ آگئی

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی۔ بلکہ پگڈنڈی کے ڈھلان پر دوڑتی ہوئی وہ بالکل میرے قریب آ کے رک گئی، اس نے آہستہ سے کہا "ہائے!"

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، رک جاتی پھر تیزی سے چلنے لگتی، اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔ اندر پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا۔ اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا۔ اور میں نے اس سے کہا۔

سہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

اس نے ہنس کر کہا: اب رات ہو گئی ہے۔ بڑی اچھی رات ہے یہ۔ اس نے اپنا کمرہ تنہا چھوڑا سا ہات میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا۔ اور جیسے باوادم کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو گئی۔ دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ سنہری بولی: اباسی کے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے کیونکہ میں نے کہا مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی ہیلی رجو کے گھر سونا ہے۔ سونا نہیں ہے جاگنا ہے۔ کیونکہ باوادم کے پہلے شگونوں کی خوشی میں ہم سب ہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی۔ اور یہی تو سہ پہر سے تیار کر رہی تھی، اور آگے کی، لیکن وہاں صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا جو کل دھویا تھا، آج سوکھا نہ تھا اسے آگ پر سکھایا۔ اور اماں جنگل سے لکڑیاں چننے گئی تھیں، وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آئیں میں کمی کے بٹھے اور خشک خوبانیا اور جردالو تنہا رہے لئے کیسے لا سکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لانی ہوں تنہا رہے لئے، ہائے تم تو پچ پچ خفا کھڑے ہو۔ میری طرف دیکھو میں آگئی ہوں۔ آج چپے

چاند کی رات ہے۔ آؤ کف سے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور حبس کریں۔

اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اہ میں نے اس کی محبت اور
 میں گم پتلیوں کو دیکھا جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اہ یہ چاند مجھ سے کہ
 جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پیلے شگوفوں
 مسرت بھرتیو ہار ہے۔ آج اُس نے تمہارے لئے اپنی ہیلیوں اپنے آباپتی
 من اپنے بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے کیونکہ آج پورے چاند کی
 ہے۔ اہ بادام کے سپید خنک شگوفے برون کے گالوں کی طرح چاندور
 پیلے ہوئے ہیں۔ اہ کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچے کے دودھ کی
 اہ آئے ہیں۔ اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ستلڑی دیکھی۔ یہ
 ستلڑی اس کے گلے میں ڈال دی اہ اس سے کہا : تو آج رات بھر جاگے گی۔ آ
 کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں
 جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سرخ ستلڑی پہن ے
 چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا، پ
 یکایک کہیں کسی پٹریا یک بلبل نغمہ سرا ہو انھی، دودھ کشتیوں میں پورا رخ بھلا
 لگے، اہ تنگوں سے پرے بستی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی۔ گیت اس
 بچوں کے تھپتھپانے کی بھاری آوازیں اور تھپتھپانے کی رونے کی
 صدا میں جھپٹوں سے اہ زندگی کا آہنہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں۔ اور شام
 کھانے کی ہلک۔ مچلی اہ بھات اہ کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اہ لطیف
 اہ پورے چاند کی رات کا بہار آفریں جو بن۔ میرا غصہ دھل گیا۔ میں نے اس
 ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اہ اس سے کہا : آؤ چلیں جھیل پر۔

پل گزر گیا۔ پگڈنڈی گزر گئی۔ بادام کے درختوں کی قطار ختم ہو گئی، تہ
 اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک
 ہے تھے، مینڈک اور جھینگرا اور بیٹھے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور
 ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خواب ناک مفتی اور سو فی، ہونی جھیل کے بیچ میں
 مذکی کشتی کھڑی تھی ساکن، چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، ہزاروں سال
 سے اسی طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر، متحاری اور متحارے محبوب
 مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر۔ یہ پورے
 ملک کی حسین پاکیزہ رات کی کنواری کے بے چھوٹے جسم کی طرح بہت
 قدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوابانی کے ایک پٹرے بندھی تھی۔ جو بالکل جھیل کے کنارے
 لگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی۔ اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آ رہی
 تھی۔ اور مینڈک ہیرے ہوئے گارے تھے۔ اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو
 تاجاتا تھا۔ اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں
 نے دونوں ہات اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اس کے زرد زرد سے اپنے سینے سے
 لگا لیا۔ جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چوم رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں
 اور جھیل کی سطح پہلاکھوں کنول کھل گئے۔ پھر میں نے اس کے رخسار چومے اور
 نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکایک بلند ہو کے صدا ہاگیت گانے لگے پھر
 میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندوں مجدوں اور کلیساؤں میں
 دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں
 اڑنے والے بادل سب مل کے ناچنے لگے۔ پھر میں نے اس کی ٹھوڑی کو چوما
 اور پھر اس کی گردن کے پیچ و خم کو۔ اور کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح

اور گیت بند ہو کر کے جسم ہوتے گئے۔ اور ناپ چ دھیم پڑتا پڑتا مارا گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی کھیل کے نرم نرم بوسے اور کوئی چھاتی سے لگا سکیاں سے رہا تھا۔

میں نے آہستہ کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہو گئی۔ نہ ادھر بہتی تھی نہ اُدھر۔ میں نے چپو اٹھا کر کشتی میں رکھ دیا۔ اُس نے پوٹلی کھولی۔ اُس میں سے جردالو نکال کے مجھے دیئے۔ خود بھی کھانے لگی۔

جردالو خشک تھے اور کھٹے میٹھے

وہ بولی، یہ پھلی بہار کے ہیں

میں جردالو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی

پھلی بہار میں تم نہ تھے۔

پھلی بہار میں میں نہ تھا۔ اور جردالو کے پٹر پھلوں سے بھر گئے تھے۔ اور ندی کی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ پھلی بہار میں میں نہ تھا۔ اور جردالو کے پٹر پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز جردالو۔ سخت کھٹے جردالو جو ناک مرچ لگا کے کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی اور پھر بھی کھٹے جردالو کھائے جاتے تھے۔ پھلی بہار میں میں نہ تھا اور یہ سبز سبز جردالو پک کر پیلے اور سنہرے اور سرخ ہوتے گئے۔ اور ڈال ڈال میں مسرت کے سرخ شگونے جھوم رہے تھے۔ اور مسرت بھری آنکھیں چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں انہیں جھومتا ہوا دیکھ کر قص سی کرنے لگتیں۔ پھلی بہار میں میں نہ تھا۔ اور سرخ سرخ جردالو

خوبصورت ہاتھوں نے اکٹھے کر لئے۔ خوبصورت لبوں نے ان کا نازہ رس چوسا
اور انہیں اپنے گھر کی چھت پر لے جا کر سو کھنے کے لئے رکھ دیا۔ کہ جب یہ جرد الو
سو کہ جائیں گے۔ جب ایک بہار گزر جائے گی، اور دوسری بہار آنے کو ہو گی،
تو میں آؤں گا اور ان کی لذت سے لطف اندوز ہو سکوں گا۔

جرد الو کھا کے ہم نے خشک خوابانیاں کھائیں۔ خوابانی پہلے تو بہت
میشی معلوم نہ ہوتی۔ مگر جب دہن کے سبب میں گھل جاتی تو شہدِ شکر کا مزہ
دینے لگتی۔

• نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ۔ میں نے کہا
اس نے ایک گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوابانی کا بیج نکال کے مجھے
دیا: کھاؤ۔

• بیج بادام کی طرح میٹھا تھا۔

• ایسی خوابانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں۔

اس نے کہا: یہ ہمارے آنگن کا پیر ہے۔ ہمارے ہاں خوابانی کا
ایک ہی پیر ہے مگر اتنی بڑی اور سرخ اور میٹھی خوابانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں
یا کہوں۔ جب خوابانیاں یک جاتی ہیں۔ تو میری ساری ہیلیاں اکٹھی ہو جاتی
ہیں۔ اور خوابانیاں کھلانے کو کہتی ہیں پھلی بہار میں۔

اور میں نے سوچا پھلی بہار میں میں نہ تھا۔ مگر خوابانی کا پیر آنگن میں ہی
رہ کھڑا تھا۔ پھلی بہار میں وہ نازک نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان
ساکھی خوابانیوں کے سبز اور نو کیلے پھل لگے تھے۔ ابھی ان خوابانیوں میں گٹھلی
پیدا ہوتی تھی اور یہ کچے کٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے
تھے۔ پھلی بہار میں میں نہ تھا اور ان خوابانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہو گئی

تھیں۔ اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا۔ اور گھسیلوں کے اندر
 نرم نرم شمع اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے پھلی بہار میں
 میں نہ تھا اللہ یہ سرخ سرخ خوبانیاں جو اپنی رنگت میں کشمیری دوشیزاؤں کی طرح
 صبح تھیں اللہ ایسی ہی رس دار۔ سبز سبز تپوں کے جھومروں سے جھانکتی نظر
 آتی تھیں۔ پھر اٹھ راکیاں آگن میں ناچنے لگیں۔ اور چھوٹا بھائی مدخت
 کے اوپر چڑھ گیا۔ اور خوبانیاں توڑ توڑ کر اپنی بہن کی ہیلیوں کے لئے چنکتا
 گیا۔ کتنی میٹھی تھیں وہ پھلی بہار کی رس بھری خوبانیاں۔ جب میں نہ تھا ...
 خوبانیاں کھا کے اس نے کئی کا بھٹا نکالا۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو
 تھی۔ سنہرا سیدھا ہوا بھٹا۔ اور گڑے دانے صاف شفاف بوتیوں کی سی چلا
 لئے ہوئے اور ذائقے میں بے حد شیریں۔

وہ بولی : یہ مصری مکی کے بھٹے ہیں ۔

بے حد میٹھے۔ میں نے بھٹا کھاتے ہوئے کہا

وہ بولی : پھلی فصل کے رکھے تھے۔ گھروں میں چھپا کے۔ اماں

کی آنکھ سے اوجھل ۔

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا۔ دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں
 پھر اُس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لئے رہنے
 دیں جنہیں میں کھانے لگا۔ اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے سے کھاتے
 گئے۔ اللہ میں نے سوچا یہ مصری مکی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں۔ یہ پھلی فصل کے
 بھٹے۔ جب تو تھی لیکن میں نہ تھا۔ جب تیرے باپ نے بل چلایا تھا کھیتوں
 میں، گوڑی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز
 رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اگانے تھے۔ جن میں نے نہانی کی تھی۔

پھر پورے بڑے ہو گئے تھے اور ان کے سروں پر ٹسریں نکل آئی تھیں اور ہوا
 میں جھومنے لگی تھیں۔ اور تو منکی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی،
 جب میں نہ تھا۔ لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہرے تھے، اور وہ بھرے
 دانے جن کی نازک جلد کے اوپر گز دیا سا بھی تاخن لگ جاتے تو وہ دودھ باہر نکل
 جاتا ہے۔ ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھڑکتی نے اگائے تھے اور میں نہ تھا،
 اور پھر یہ بھٹے جوان اور توانا ہو گئے اور ان کا رس پختہ ہو گیا۔ پختہ اور سخت۔ اب
 تاخن لگانے سے کچھ نہ ہوتا تھا۔ اپنے تاخن ہی کے ٹوٹنے کا احتمال تھا۔ بھٹوں
 کی مونچھیں جو پہلے پھلی تھیں۔ اب سنہری اور پھر اسنہری سیاہی مائل ہوتی
 سیں۔ مکی کے بھٹوں کا رنگ زمین کی طرح بھوسا ہوتا گیا۔ میں جب بھی نہ آیا تھا
 اور پھر کھیتوں میں کھلیاں لگے، اور کھلیاں انوں میں بیل چلے۔ اور بھٹوں سے
 دانے الگ ہو گئے۔ اور تو نے اپنی ہیلیوں کے ساتھ محبت کے گیت گائے
 اور تھوڑے سے بھٹے چھپا کے اور سینک کے الگ رکھ دیئے۔ جب میں نہ
 تھا۔ صرف قیامت، تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔ آگ پر سینکے ہوئے بھٹے
 تھے۔ لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرت سے اس کی طرف نا دیکھا اور کہا: آج پورے چاند
 رات کو جیسے ہر بات پوری ہو گئی ہے۔ کل تک پوری نہ تھی۔ آج پوری ہے۔
 اس نے بھٹا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹوں کا گرم گرم لمس
 اس ابھی تک اس بھٹے پر تھا۔ میں نے کہا: میں تمہیں چوم لوں؟
 وہ بولی: ہٹس، کشتی ڈوب جائے گی۔

تو پھر کیا کریں؟ میں نے پوچھا

وہ بولی: ڈوب جانے دو۔

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے
 قریب ہے، لیکن وہ پورے چاند کی رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی
 ہے، جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں
 کی ہوگی۔ اُس نے بھی نہیں کی ہوگی۔ وہ جادو ہی کچھ اٹھ تھا۔ جس نے پورے
 چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی
 اسی رات میرے ساتھ بھاگ آئی۔ اور ہم پانچ چھ دن محبت میں کھوئے ہوئے
 بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی تالوں پر خروٹوں کے سایوں تلے
 گھومتے رہے دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر میں نے اسی جیل کے کنارے
 ایک چھٹا سا گھر خرید لیا۔ اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے۔ کوئی ایک مہینہ
 کے بعد میں سہمی کر گیا۔ اور اُس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں
 گا۔ تیسرے دن میں لوٹ آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل
 مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے
 ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں۔ اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں
 نے انہیں دیکھ لیا۔ لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرت میں اس
 قدر مٹھو تھے کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ اور میں نے سوچا کہ یہ پھلی بسا
 یا اس سے بھی پھلی بہار کا محبوب ہے جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید اس کے بھی
 کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی۔ کتنی ہی پورے چاند کی راتیں جب محبت ایک
 فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی۔ اور عریاں ہو کے رقص کرنے
 لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خسراں آگئی ہے۔ جیسے ہر بہار کے بعد آتی ہے
 اب تیرا یہاں کیا کام۔ اس نے میں یہ سوچ کر اُن سے ملنے بغیر ہی واپس چلا گیا

اور پھر اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اٹتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے۔ لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور اُن کے بچے میرے ساتھ ہیں، ادھم لوگ میرے کرتے کرتے محل جمیل کے کنارے آ سکے ہیں۔ ادھاپریل کا مہینہ ہے۔ ادھر پہرے شام ہو گئی ہے ادھیں دیر تک پل کے کنارے کھڑا بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خشک ہوا میں سفید شگرفوں کے گچھے ہر اتے جلتے ہیں۔ ادھ گپڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین ڈھنڈھ ٹکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار تنگوں سے پرے بتی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے۔ وہ اس کے کھلنے پر بلارہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے۔ اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے۔ چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے اکدم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور پھر ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی ہابخی گا رہا ہے۔ ادھ اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اُس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔

میں پل کو پارک کے آگے بڑھتا ہوں۔ میرے بیٹے امدان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہو گئی، تلہ بھی ختم ہو گیا۔ جمیل کا کنارہ ہے، یہ خوابی کو درخت ہے لیکن کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مگر کشتی کشتی ہے مگر کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے۔ میری پہلی بہار کا گھر۔ میری پوری

چاند کی رات کی محبت ..

گھر میں بدشگونی ہے۔ بچوں کی صدا نہیں ہیں۔ کوئی بعد ہی آواز میں گانے
گلتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چمچ کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں آدمی صدی
ہو گئی ہیں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔ اس فرم میں
اُسے خرید لیا تھا۔ دیکھا جائے تو میں ابھی تک اس کا مالک ہوں۔ دیکھ لینے میں
ہرج ہی کیا ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لئے
رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کے ششک جاتی ہے۔ دو بچے ڈر رہے
تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا جو ابھی غصہ میں ڈانٹ
رہی تھی۔ تم کے پاس اس کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کہتی ہے "کون ہو تم؟"
میں نے کہا: "یہ گھر میرا ہے"

وہ بولی: "تمہارے باپ کا ہے"

میں نے کہا: "میرے باپ کا نہیں ہے میرا ہے۔ کوئی اثالیس
سال ہوئے میں نے اُسے خرید لیا تھا۔ بس اس وقت تو یوں ہی میں اسے دیکھنے
کے لئے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نہ کالنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس مجھے
اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یوں ہی ... میں یہ کہہ کر روٹنے لگا۔ بڑھیا کی آنکھیں
سختی سے تم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زود سے اندر کو کھینچی۔ بولی: "تو تم ہو ..."
اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے ...

وہ تم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آنکھ میں چپ
چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی۔ بولی: "آؤ میں
تمہیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں ... دیکھو، یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس کے

پھٹتا ہے۔ یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔ یہ میرا بڑا پوتا ہے، سلام کر دینا۔ یہ پوتی
 ... یہ ... یہ میرا خاندن ہے۔ شش اسے جگانا نہیں۔ پرسوں سے اسے
 بخار آ رہا ہے۔ سونے والا ہے۔ ...

وہ بولی۔ تمہاری کیا خاطر کروں؟

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکی کے بھٹوں کو دیکھا۔ سینکے
 ہوئے بھٹے۔ سنہرے موتیوں کے سے شفاف دانے۔
 ہم دونوں مسکرا دیئے۔

وہ بولی: مسیکر تو بہت سے دانت جھڑچکے ہیں۔ جو ہیں بھی وہ کام
 نہیں کرتے۔

میں نے کہا: یہی حال میرا بھی ہے۔ بھٹانہ کھا سکوں گا؟
 مجھے گھر کے اندر گھومتے دیکھ کر مسیکر گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے۔
 سب خوب گھبرا گئی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے بہت جلد مل جل گئے۔
 ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جمیل کے کنارے
 چلتے گئے۔

وہ بولی: میں نے چھ برس متھارا انتظار کیا۔ تم اس روز کیوں نہیں
 آئے؟

میں نے کہا: میں آیا تھا۔ مگر تمہیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ
 لیا پس چلا گیا تھا۔

کیا کہتے ہو؟ وہ بولی

ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں ایک ہی رکابی میں، اور وہ تمہارے
 لیے تھا۔ تم اس کے منہ میں لقمے ڈال رہی تھیں۔

وہ اک دم چپ ہو گئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ زور زور سے ہنسنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا

وہ بولی: ”ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا“

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا اسی روز،

اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے اُسے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے۔ تم پھر کسے ہی نہیں۔“

وہ اک دم بخیدہ ہو گئی۔ چہرہ برس میں نے متحار انتظار کیا۔ متحارے

جانے کے بعد مجھے خدا نے بیٹا دیا، متحار بیٹا۔ مگر ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ چار

سال اور میں نے تمہاری راہ دیکھی۔ مگر تم نہیں آئے۔ پھر میں نے شادی کر لی۔“

دونپے باہر نکل آئے، کھیلے کھیلے ایک بچہ دوسری بچی کو لگی کا بھٹ

کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا: ”وہ میرا پوتا ہے۔“

میں نے کہا: ”وہ میری پوتی ہے۔“

وہ دونوں بھاگے بھاگے جھیل کے کنارے کنارے دھڑک چلے

گئے زندگی کے دو خوبصورت مرقے۔ ہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے

قریب آ گئی۔ بولی: ”آج تم آئے ہو تو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اب اپنی

زندگی بنالی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ہر بھرا گھر ہے

اس آج تم بھی آئے ہو۔ مجھے خدا کی بڑا نہیں لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا: ”یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تمہیں نہیں ملوں گا

اسی لئے اتنے برس اور کبھی نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو ذرا رتی بھر بھی بُرا نہیں لگتا

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بچے کھیلے کھیلے ہمارے پاس واپس آ گئے۔
 اس نے میری پوتی کو اٹھایا۔ میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما
 میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
 اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا۔ اور وہ چاند حیرت سے اور مسرت سے کہہ رہا
 تھا: انسان مر جاتے ہیں۔ لیکن زندگی نہیں مرتی۔ بہار ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر
 دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن زندگی کی بڑی
 عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں کھلی بہار میں نہ تھے۔ یہ بہار تم نے
 دیکھی اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور
 جوانی بھی ہوگی اور خوبصورتی اور عنائی اور مصومیت بھی ...

بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ
 بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے جہاں کشتی بندھی تھی۔
 میں نے پوچھا: یہ وہی درخت ہے؟

اس نے مسکرا کر کہا: نہیں یہ دوسرا درخت ہے۔

خل ہے دماغ کا

سب سے پہلی بات جو میری بکھ میں اس وقت آئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ اور یہ بات میں آپ کو اس کہانی کے شروع میں بتانا چاہتا ہوں۔ تاکہ بعد میں خلط فہمی نہ رہے کسی قسم کی سہاں تو وہ بات یہ ہے کہ مجھے محبت کے لفظ سے، محبت کے تخیل سے، اور محبت کے نام ہی سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اول تو ہندوستان میں محبت ہوتی ہی نہیں۔ سرے ہی سے غائب ہے۔ جیسے یہاں اور بہت سی چیزیں ہونے کے باوجود غائب ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں ہی کو لے لو۔ کہنے کو تو یہ لوگ ہندو اور مسلمان ہیں۔ لیکن دراصل ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں۔ جو دراصل ہندو ہو یا مسلمان۔ کہنے کو تو یہ لوگ امدان کا ملک ہندو اور مسلمان

کا پرانا اور تہذیب یافتہ ہے۔ لیکن جتنے کینے۔ جتنے حیوان جتنے ظالم
 اس ملک کے باسی ہیں۔ شاید ہٹلر نے فسطائیت سے اپنے عروج کے زمانے
 میں بھی نہ پیدا کئے ہوں۔ جو حال یہاں کے انسانوں کا ہے۔ وہی حال یہاں کی
 محبت کا ہے۔ میرا تو دعویٰ ہے کہ اس ملک میں محبت ہی نہیں۔ اور اگر کہیں ہے
 تو اس قدر مری مری سی۔ اس قدر گھٹی گھٹی سی۔ اس قدر بد حال۔ ٹوٹی پھوٹی، یا اس
 انگیز کہ ایسی محبت سے تو جیتی جاگتی نفرت ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کیوں
 جائے۔ اس ملک کے محبت کرنے والوں ہی کو دیکھئے۔ ہیرا خجہا، سوہنی ہینڈول
 روپ متی باز بہاؤ، افضل خاں زیب النساء اور علی ہذا القیاس آپ کی محبت
 کرنے والے کی زندگی کو دیکھئے۔ آپ اس میں ایک عجیب قسم کی نحوست، نامردی
 بھوست کا اثر دیکھیں گے۔ ایک مدقوق مرخصانہ کیفیت اس محبت کے جذبے
 پر طاری رہتی ہے۔ یعنی مرے جاسے ہیں مگر محبت کا لفظ زبان پر نہیں آئے گا
 عرض دعا کی جرات نہیں۔ یوں دن بھر معشوق کے فراق میں گھلے جائیں گے
 جمع کی طرح جل جائیں گے مگر کو اس نہیں کریں گے کہ ہاں ہم بھی محبت کرتے
 ہیں۔ آخر بتاؤ کہاں جائیں۔ وہ سوچتی ہے کہ سوہنی رات کو چناب پر اپنے
 محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ وہ راجھا ہے کہ فقیر بن کے بھینس چراتا ہے۔
 وہ افضل خاں ہے کہ بوسے کی دیگ میں ابل کر مر جاتا ہے۔ مگر کسی سارے
 میں اتنی ہمت نہیں کہ زبان سے کہ سکے کہ میاں دیکھو۔ ہمیں تم سے محبت
 ہے اس کا کوئی مداکارہ۔ اس قدر کم، جاہل۔ گھینچو قسم کی محبت ہے اس
 ملک میں۔ کاش اس ملک میں محبت کم ہوتی اور نفرت زیادہ ہوتی تو کب کا اس
 ملک میں سوشلزم آگیا ہوتا۔ مگر ہمیں تو اس محبت نے مار ڈالا۔ اور کسی ملک میں
 دنیا کے کسی کونے میں کوئی آدمی اپنے دشمن سے محبت نہیں کرتا ہے۔ اللہ اگر

کوئی کرتا ہے۔ تو صرف ہندوستان والا۔ جس ملک میں سانپوں کو دودھ پلانے کا
 رواج ہو اس ملک میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ خیر صاحب مجھے کیا میں تو
 کہانی سنانے والا ہوں۔ دو لمحے کا قصہ خواں ہوں۔ دو ہزار سال کی تاریخ سے
 مجھے کیا سروکار۔ وہ محبت کا ذکر تو یوں آگیا۔ کہ میں آپ کو محبت کی کہانی سنانے
 جا رہا تھا۔ یہ کہانی ہمارے قصبے کے ذیلدار صاحب کی ہے۔ جنہیں اپنے
 گاؤں کی رٹ کی چھبیلی سے محبت تھی۔ دراصل ذیلدار صاحب کو گاؤں کی
 ہر نوجوان رٹ کی سے محبت ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی ان سے محبت
 کرے یا نہ کرے۔ اور میں نے ذیلدار صاحب کو گاؤں کی ننھی رٹ کیوں، بلکہ ایسی
 رٹ کیوں سے بھی محبت کرتے دیکھا ہے۔ جو ابھی عرض وجود میں بھی نہ آئی ہو یا
 مثلاً ان کا یہ فقرہ گاؤں کے لوہار کی حاملہ بیوی پارو کے متعلق مجھے، ابھی تک
 یاد ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ آدھے آدھے بادلوں سے آسمان گھرا ہوا تھا۔
 آسمان پر چاند کے پیروں پر خوش اچان طیور چہرہ رہے تھے۔ گھاس پر شبہ کی
 لاکھوں بوندیں۔ بس یوں سمجھئے کہ فضا میں جوش ملیح آبادی کی شاعری تڑپ
 رہی تھی۔ ایسے وقت میں میں اور ذیلدار صاحب ذرا گھومنے جا رہے تھے۔ صبح
 سیر کرنا بڑا صحت مند کام ہے۔ سیر ہو جاتی ہے۔ راستے میں ہوتا زہل جاتی ہو
 اور پیچیدگی پر جوان رٹ کیوں بھی دیکھنے میں آ جاتی ہیں۔ معلوم نہیں ذیلدار صاحب
 کیوں روز صبح سیر کو نکلتے تھے۔ میں تو صرف صحت ٹھیک کرنے کے خیال
 سے نکلتا تھا۔ اور پھر یہ خیال بھی تھا۔ چلو گاؤں کا حاکم ساتھ ہی ہے۔ اچھا ہے
 گا۔ لوگ باگ سلام ہی کریں گے۔ ہاں تو میں وہ فقرہ تو بھول ہی گیا۔ جو
 ذیلدار صاحب نے پارو کو دیکھ کر کہا۔ کہنے لگے۔ میاں یہ پارو، شادی سے پہلے
 بہت اچھی تھی۔ پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد فرمایا اس کی بیٹی بھی بہت اچھی ہوگی

میں نے سوچا۔ بیچارہ پارو کی بیٹی سے ذیلدار صاحب کی محبت کی بنیاد حمل کے ساتھ
 ہی پڑ گئی۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ ہیں وہ رڑکی پیدا ہوتی۔ بڑی ہوتی۔ جوان ہوتی۔
 ذیلدار سے دیکھتے۔ پھر تیر نظر کے گھائل ہوتے۔ جب جگہ کے کہیں محبت کرتے
 تو کیا خاک کرتے۔ محبت وہ جو معشوق کے پیدا ہونے سے پہلے خود پیدا ہو۔ اس
 معاملے میں ذیلدار صاحب سے بہتر محبت کہنے والا میری نظر میں کوئی نہیں،
 آپ کی نظر میں ہو۔ تو اس کی کہانی آپ سنا بیے۔

ذیلدار صاحب کو گاؤں کے چار کی بڑی بیٹی چھبیلی سے محبت ہو گئی۔ اور وہ
 بھی سچی۔ گو اس سے پہلے ذیلدار صاحب گاؤں کی کئی ایک رڑکیوں سے سچی محبت
 کر چکے تھے۔ مگر آخر میں۔ وہ محبت کچھ جموٹی سی ہو جاتی تھی۔ پر اب کے ذیلدار صاحب
 نے خود مجھ سے کہا تھا۔ اس بذات چہارن سے مجھے سچی محبت ہو گئی ہے۔
 ذیلدار صاحب اس سے پہلے تین بیاہ کر چکے تھے۔ اور تینوں سے باری باری
 سچی محبت کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اس پاس اڑھائی لکھن سچی محبت
 شروع کی۔ اڑھائی طرح سچی محبت کرتے کرتے دوسرے گاؤں تک پہنچ گئے۔
 ایک دفعہ جیل بھی پہنچنے والے تھے۔ مگر روپے نے چھڑا دیا۔ دراصل سچی محبت
 کرنے والے تو اس ملک میں بہت ہیں۔ مگر روپیہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا اور
 سچی محبت وہیں کامیاب ہوتی ہے۔ جہاں روپیہ ہو۔ یہ سچی محبت کی خاصیت
 ہے۔ اگر آپ کے پاس روپیہ ہو۔ تو آپ دیکھیں گے کہ آپ سے سچی محبت
 کرنے والے اس ملک میں آپ کو بہتیرے مل جائیں گے۔ ہاں اگر روپیہ نہ ہو
 تو پھر سچی محبت کرنا اس ملک میں خطرے سے خالی نہیں۔

چھبیلی پر میری بھی آنکھ تھی۔ میں شہر گاؤں کا اسکول ماسٹر۔ یعنی گاؤں کے
 بچوں کے اخلاق کا محفاظ۔ گاؤں والوں کی سوجھ بوجھ میں گاؤں کا اسکول

ماسٹر ہی اچھا ہوتا ہے۔ جو قریباً قریباً نامرد ہو۔ اس لئے گاؤں کے اسکول ماسٹر
 سے کوئی یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ بھی کئی رٹ کی سے محبت کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا
 کرنے سے گاؤں کی سماجی زندگی میں بھونچال آجائے گا۔ اند گاؤں کے بچوں کے
 اخلاق تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں گاؤں کا اسکول ماسٹر ہو کر دو
 اخلاق کا اور علم کا مبلغ ہو کر کئی رٹ کی سے محبت نہ کرتا تھا۔ صرف اُن پر آنکھ رکھتا
 تھا۔ اور اب یہ تو کسی شاستر میں نہیں لکھا ہے کہ ایک جوان تندرست و توانا آدمی
 کئی رٹ کی پر آنکھ بھی نہیں رکھ سکتا ہے۔ بس یہی کام میں نے بھی کیا۔ میں تحصیل
 سے محبت بھی کرتا لیکن گاؤں والے اس امر کی اجازت ایک اسکول ماسٹر
 کو کہاں دیتے تھے۔

تو ذیل در صاحب اور میں ہر روز صبح اُن کو کر سیر کے لئے جایا کرتے۔ گاہے گاہے
 پنکھٹ پر یا راستے میں۔ یا جنگل کے کنارے، جہاں کوئی نہ ہوتا ہماری ملاقات
 تحصیل سے ہو جاتی۔ ہائے مجھے وہ کہانیاں کتنی پسند ہیں۔ جہاں دو محبت کرنے
 والے کسی دریا یا ندی یا جنگل کے کنارے اکیلے میں مل جاتے ہیں۔ جی چاہتا
 ہے بار بار ان کہانیوں کو پڑھا کر د۔ ذرا سوچئے تو یہی کہ اگر آپ کی محبوبہ آپ کو
 کسی جنگل یا دریا یا ندی کے کنارے اکیلے میں مل جائے تو کیا رہے۔ محض اس
 کے تخیل ہی سے آپ کا دل تلیں اچھلنے لگتا ہے۔ ہے نا ذرا سوچئے تو یہی
 کہ ہم افسانہ نگار بھی آپ کی اس کمزوری سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اپنی ہر کہانی
 میں ایک نہ ایک ایسا موقع ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ اور خدا کی قسم ہے کہ آپ بھی
 اس قدر گمے ہیں کہ ان کہانیوں کو بار بار پڑھتے ہیں۔ اور کبھی نہیں سوچتے کہ
 ایم اے و امت از مخفی سے زیادہ پاپور کیوں ہیں۔
 ہاں تو تحصیل میں اکیلے جنگل کے کنارے یا پنکھٹ پر یا راستے میں کسی بار

ہم تو چونکہ صرف اس پر آمکر رکھتے تھے اس لئے صرف دیکھنے پر اکتفا کرتے تھے۔
 ہاں ذیلدار صاحب دیکھنے کے علاوہ اس سے باتیں بھی کرتے تھے۔ سنہی مذاق
 ٹھٹھا اور چھپڑ چھاڑ کہ سچی محبت میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی چمک کر جواب
 دیتی۔ بھادبتاتی۔ بگڑ جاتی۔ من جاتی۔ مگر پوچھتا کہ چھوٹے نہ دیتی۔ اس بات کا ذیلدار
 صاحب کو بے حد ملال تھا کہ سالی بڑی حرام زادی ہے۔ پیٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے
 دیتی۔ پھر بھی وہ سچی محبت کئے جاتے تھے۔ کھنے تحائف۔ چاندی کے چھلے
 ریشم کے کپڑے۔ طلائی کام کی جوتیاں جو چھپیلی کا باپ خود بناتا تھا۔ روپے
 گول گول ترشے ہوئے سونے کے ٹکڑے۔ چاندی کے ٹکڑے۔ آدھی نکل آدھی
 چاندی کے ٹکڑے۔ مگر روپے۔ چھپیلی کا باپ بڑا بھو دار آدمی تھا۔ اس نے آہستہ
 آہستہ ان روپوں سے بننے کا قرض اٹا دیا۔ ذیلدار صاحب سے اپنی زمین صاف
 کرائی۔ اپنے کچے مکان کی مرمت کرائی۔ اور اپنی بیٹی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا۔ یہاں
 کون سا ایسا بوزر واطبقے کا باپ ہے۔ جو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ لوگ پہلے
 تو عزت عزت کرتے سوکھ جاتے ہیں۔ اور جب بالکل امیدوں کا قحط پڑ جاتا
 ہے۔ تو پھر اپنی راکھوں کو شرکوں پر عصمت نیچنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور
 پھر ان کی یاد میں خود روئے روئے مر جاتے ہیں۔ اس قدر چھوٹے غیر عملی خود کو
 دھوکا دینے والے لوگ ہیں یہ۔ مگر چھپیلی کا باپ ایسا نہ تھا۔ نہ چھپیلی ایسی رکی
 سکتی۔ وہ لوگ غریب تھے۔ متوسط طبقے کے نہ تھے۔ متوسط طبقے کی شرافت ان
 میں نہ تھی۔ نہ وہ متوسط طبقے کی طرح سوچ سکتے تھے۔ وہ غریبوں کے سماج میں
 پلے بڑھے تھے۔ ذیلدار سے روزانہ کی ٹڈ بھڑ ہوتی تھی۔ صدیوں سے ہو رہی تھی
 وہ اس کا مقابلہ نہ کرنا خوب جانتے تھے۔ ہار بھی جانتے۔ جیت بھی جانتے۔ بہر حال
 اپنے ماحول کو جتنی اچھی طرح وہ سمجھتے تھے اور کون بھو سکتا ہے۔ اس کہانی

سنانے والے سے تو یہ ممکن نہیں۔ کہ وہ اُن کے طرز عمل پر نکتہ چینی کر سکے۔ ہاں آپ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی بیٹیاں گھر میں رہتی ہیں۔ اسگو بوں میں پڑھتی ہیں فکر کوں سے بیاہی جاتی ہیں۔ اور ان کا پالا کبھی کسی نویدار سے نہیں پڑتا۔ میرا مطلب ہے کہ بالواسطہ طور پر نہیں پڑتا۔

اچھا! تو نویدار صاحب اور چھبیلی کی محبت کا قصہ عام ہوتا گیا۔ رکیاں گیت گانے لگیں۔ چر دا ہے سیٹیاں بجانے لگے۔ نویدار صاحب دن رات چھبیلی کے عشق میں غلٹاں رہنے لگے۔ اُن کا جسم گھلتا گیا۔ رنگ پیل پڑتا گیا۔ اکثر صبح کو وہ تے بھی کر دیتے کیونکہ سچی محبت میں یوں بھی ہوتا ہے۔ کئی عاشق خود کشی بھی کر لیتے ہیں۔ مگر نویدار صاحب صرت تے پر اکتفا کرتے تھے۔ اور بات صرف یہ تھی کہ نویدار صاحب اپنے تمام تحائف اور پچھے وعدوں اور سچی محبت کے باوجود چھبیلی کے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے تھے۔ وہ ایسی حرافہ تھی کہ نویدار صاحب سے سچی محبت جتانے کے باوجود بھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوتی تھی۔ تاؤ تلیک ان کی شادی نہ ہو جائے۔

شادی؟ آپ ٹھنک کیوں گئے۔ کیا ہر سچی محبت کی معراج شادی نہیں۔ شادی چاہے جنت میں ہو یا زمین پر شادی کا مطلب تو یہی ہے تاکہ عہد مت اور مرد و عورت ساتھ رہیں۔ اور لوگ اُن کے اس طرح ساتھ زندگی بسر کرنے کو بُرا نہ کہیں۔ اگر یہ بات شادی کے بغیر حاصل ہو جائے تو شادی کی کیا ضرورت ہے۔ مگر چونکہ لوگوں کی جہالت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا اس لئے چھبیلی شادی پر زور دے رہے تھی۔ اور نویدار صاحب سچی محبت پر زور دے رہے تھے۔ کہ سچی محبت میں جہاں مدد ملے۔ آپ سمجھے نا۔ جہاں مدد ملے۔ درد میں آپ میں مل جائیں۔ وہاں خدا دیکھتا ہے۔ وہاں شادی کی کیا ضرورت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور علی ہذا القیاس۔ مگر چھبیلی اس دلیل کو منظور نہ کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذیلدار صاحب
اسی طرح سچی محبت کرتے رہے۔

پھر آخر ایک روز ذیلدار صاحب نے شادی کے لئے ہاں کہہ دی۔
یاد رہے کہ یہ واقعہ دو ڈیڑھ سال سے چل رہا تھا۔ ذیلدار صاحب کو سچی محبت نے
اتنا ستایا تھا کہ وہ اب اس لڑکی کو کسی قیمت پر بھی حاصل کرنے کے لئے تیار تھے۔
زندگی کی بڑی سے بڑی قربانی۔ اپنی املاک کی بڑی سے بڑی دولت بھی لانے
کے لئے تیار تھے۔ شادی تو معمولی چھبیلی تھی۔ وہ پہلے دوا پھلچکے تھے۔ چھبیلی
لڑکی سے شادی۔ مگر پھر سچی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ اگر مغل بادشاہ
غلاموں کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتے تھے۔ اگر ہمارا جہ دیشیت ایک ایسی
کی چھوڑی سے بیاہ کر سکتے تھے۔ تو کیا ذیلدار صاحب کو اس کا حق بھی نہ تھا کہ
چھبیلی سے شادی کر سکتے۔ ہری اوم تہ ست آمین

دھرم اور ایمان جب شادی کے لئے تیار ہو گئے۔ تو شادی کی تیاریاں
نبھونے لگیں۔ سب لوگ حیران تھے۔ بھونچکے رہ گئے تھے۔ کوئی دوسرا
ہوتا تو شاید گھاؤں سے باہر نکال دیا جاتا۔ مگر ذیلدار اور پھر گاؤں کا مالک۔ اور
پھر ستے ہزاروں روپوں کا مالک۔ گول گول سونے کے ترشے ہوئے ٹکڑے
چاندی کے ٹکڑے آدھی چاندی اور آدھی نیکل کے ٹکڑے۔ سب نے
ذیلدار صاحب کو اس نیک کام اور سچی محبت کے لئے مبارکباد دی۔ جب
کوئی امیر کسی غریب سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔ تو اس کی فراخ دلی
کا چرچا ہر جگہ ہوتا ہے۔ اور جب کوئی غریب کسی امیر سے شادی کرنے کے
لئے کمر لے۔ تو ساری دنیا اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ سچی محبت وہاں
بھی ہوتی ہے۔ سچی محبت یہاں بھی ہوتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں (روپیہ بھی

ہوتا ہے۔ اور یہاں صرف سچی محبت ہوتی ہے۔

شادی سے پہلے چھبیلی نے یہ شرط رکھی کہ اس کے باپ کو چھ ہزار روپے ذیلدا عطا کرے۔ ذیلدار صاحب پہلے تو بہت بھٹائے۔ اور اگر ان کے دل میں سچی محبت نہ ہوتی تو شاید انکار کر دیتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ اور انھوں نے چھپکے سے یہ روپیہ دے دیا تاکہ وہ اپنے باپ کو دے دے۔ یہ شادی سے ایک روز پہلے کی بات ہے۔

جس روز شادی ہونے والی تھی۔ اس روز چھبیلی گاؤں سے غائب ہو گئی۔ یعنی بالکل غائب ہو گئی۔ سب کیا دھڑا رہ گیا۔ ذیلدار صاحب پہلے تو یہ خبر سن کے بہوش ہو گئے۔ سچی محبت کا اثر تھا۔ جب ہوش میں آئے تو لگے گا یاں بکنے۔ اور پولس کی دھمکیاں دینے لگے۔ یہ ذیلدار ہی کا اثر تھا یا سچی محبت کا یہ میں نہیں جانتا۔ چھبیلی کا باپ بھی بے حد برا فرد خستہ تھا۔ کیونکہ اس کی لڑکی نے اسے صرف چار ہزار روپیہ دیا تھا۔ اور دو ہزار روپیہ اندک کچھ زبرد اور کسے کٹے کر وہ خود فرار ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے آدمی کے ساتھ۔ جسے اس کے ساتھ سچی محبت نہ تھی، بلکہ جو اس پر صرف آنکھ رکھتا تھا۔ یعنی یہ خاکسار۔ بندہ ناچیز۔ گاؤں کا اسکول ماسٹر۔

ذیلدار صاحب اور چھبیلی کے باپ نے آخر ہم دونوں کو پکڑا دیا۔ ہم دور کے ایک گاؤں سے پکڑے گئے۔ لیکن ہم لوگ کتنی ہی درد کیوں نہ چلے جاتے۔ روپیہ ہمیں ضرور پکڑا جاتا۔ ذیلدار صاحب لے ڈاکٹر کو رشوت دی۔ اور یہ ثابت ہو گیا عدالت میں کہ چھبیلی نابالغ ہے۔ وہ حاملہ تھی۔ مگر نابالغ تھی۔ وہ میری بیوی تھی مگر نابالغ تھی۔ کیونکہ ۱۱، ڈاکٹر اس کا کہتا تھا۔ ۱۲، ذیلدار صاحب کو سچی محبت تھی۔ ۱۳، اس کے باپ کو پورے چھ ہزار روپے نہ ملے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول ماسٹر

کو تین سال کی قید ہو گئی۔

قید کاٹنے کے بعد میں بھی آگیا۔ میں نے اسکول کی ٹیچری چھوڑ دی ہے۔ اور
 آج کل جوتے بناتا ہوں۔ اس سے ایک توڑکوں کے اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا
 دوسرے مجھے بھی روپے زیادہ ملتے ہیں۔ گانوں کا ٹیچر نذرہ روپے لیتا ہے۔
 میں ایک جوتے کے بیس روپے لیتا ہوں۔ اور میں اور چھیلی بیسنے میں دس بارہ
 جوتے تیار کر کے بیچ ڈالتے ہیں۔ ہماری بھی ابیلی بچ بڑی ابیلی ہے۔ چھیلی
 کو یقین ہے کہ ابیلی بڑی ہو کر ضرور کسی مل کے مالک کو سچی محبت کا مزہ چکے
 گی۔

مغربی گھٹا کی سیر

بمبئی سے پونا جاتے ہوئے رستے میں مغربی گھاٹ کی پُر فضا وادیاں
 دیکھنے کو ملتتی ہیں، وادیاں اور پہاڑ اور سرنگیں جن میں گاڑی عرصہ تک گم رہتی ہے
 اور گمان ہوتا ہے کہ اب اس تاریخی کے غائبے کبھی باہر نہ نکلے گی۔ چھوٹی چھوٹی
 وادیوں میں دھان کی کھیتیاں ہلہاتی ہیں۔ اور ریل کی اونچی پٹری کے کنارے
 کہیں کہیں سنکیر کے پٹیرا پنے پھولوں کی شمعیں روشن کئے نظر آ جاتے ہیں۔ سنے
 پہاڑوں پر سے کئی ہم آہنگ سینکڑوں فٹ نیچے گرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور
 پہاڑوں کی چٹانوں سے پانی بہتا ہوا کبھی کبھی ریل کی کھڑکیوں پر چھوار رسا دیتا ہے
 کبھی کبھی دھند کے مرغوعے گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اور اگر بھی تھرنے

ہوئی ہو تو دھند کے سپیداد شفاف غبار میں لپٹے ہوئے پیروں پر ہزاروں چمکتے ہوئے جگنو ہر منڈ پر کسی نئی کہکشاں کا پتہ دیتے ہیں۔ مون سون کے دنوں میں مغربی گھاٹوں کا حسن اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ اور ممبئی سے پونا کا سفر ٹراہی خوشگوار معلوم ہوتا ہے، اگر ساتھ میں اپنا دلنواز بھی ہو تو پھر سفر ریل کا سفر نہیں معلوم ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا چاند کی کشتی میں بیٹھے ہوئے کسی انتہائی جھیل کے کنارے کی طرف جا رہے ہیں پہلی بار جب میں مغربی گھاٹوں سے گزرا تو کوئی دلنواز ماحول نہ تھا۔ فقط یہی بندہ دل گداز تھا۔ جواکیلا مغربی گھاٹ کے حسن سے متاثر ہوتا رہا ہاں یہ خیالی ضرور تھا۔ اگر وہ بھی ساتھ ہوتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا جب تو ہر دادی کی درج زالی ہوتی۔ ہر ایشاد کی چھب انوکھی ہوتی۔ یہ پھول مسکراتے نہیں ہنستے ہوئے نظر آتے، وہاں کے پودوں کا ہر خوشہ ناچتا ہوا نظر آتا۔ سحر کے دھندلے میں پیروں پر ٹمٹماتے ہوئے لاکھوں جگنو ہمیں کسی نئے رستے کی سمت سے آگاہ کرتے۔ اندر سرنگوں کی تاریکی میں ملفون بو سے کس قدر لذت ہوتے ہوں گے۔ وہ یہ سب مناظر دیکھتی اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں بات دینے پونے کی طرف بڑھتے چلے جاتے ...

مگر اب تو میں اکیلا آیا تھا۔ ہاں دوسرے سیزن کے لئے میں نے تہیہ کر لیا۔ کہ اب کی بار سے ضرور ساتھ لاؤں گا۔ یہ مغربی گھاٹ کے مناظر یہ مون سون کا موسم، یہ پونا کی ریس۔ ایسے موقع پر اکیلے آنا واقعی گناہ سے کم نہیں۔ دوسرے سیزن پر ہم لوگ اکٹھے پونا کی ریس کے لئے چلے۔ یہ اکٹھے، تو میں نے بہت آسانی سے کہہ دیا۔ مگر یہ چلنا اس قدر آسان نہ ہوا تھا پہلے پہل تو کمی دفعہ ڈائیاں ہونی تھیں۔ مگر چھ فٹ کئے گئے تھے اور ہارے گئے تھے کہ کیوں ہمیں پونا ساتھ نہیں لے جایا گیا۔ تم لیکر ہی لیکر

پونا کیوں ہوئے۔ تمہیں ہم سے محبت نہیں ہے اور میں نے کہا تھا مجھے تم سے
ایسی محبت نہیں ہے جو محض مغربی گھاٹ کی وادیوں تک محدود ہو کے رہ جائے
میری جان میری محبت لازوال، دائمی، لافانی اور لایعنی ہے یعنی ایسی محبت
محبت ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس پر ہم نے انہیں منایا۔ کیونکہ عورت
صرف دو باتوں سے منائی جاتی ہے۔ محبت سے یا مار پیٹ سے، اور کیونکہ وہ
ہماری محبوبہ تھی۔ اس لئے ہم ابھی اس ابتدائی دور میں اس سے مار پیٹ نہ کر سکتے
تھے۔ یہ باتیں تو عشق کے آخری منازل میں شامل ہوتی ہیں۔ خیر صاحب یوں
تو پونا اکیلے جانے پر ہمیں کئی دفعہ دھمکایا جا چکا تھا۔ اور ہم نے کئی بار معافی
بھی طلب کی تھی۔ اب بارے ایک سال بعد پھر پونا جانے کا سیزن آیا۔ اور جب
سارے ممبران پونا چلے گئے اور اگست کا مہینہ آگیا تو ہم دو گوں نے بھی اکٹھے
پونا چلنے کی صلاح کی۔ اور بہت سی منتوں اور مراجعتوں کے بعد یہ صلاح
پکی ہو گئی۔

لیکن ہندوستان میں، کٹھے چلنا، اتنا آسان کام نہیں ہے کہ
مغربی چاہنے والوں کی طرح ہات میں ہات یا کمر میں ہات یا کندھے پر سر اور کمر
میں ہات دیا اور چل پڑے۔ یہاں انہیں کہنا پڑا کہ وہ اپنی ہیلی کے ساتھ ہیلی کے
گھر پونا جا رہی ہیں۔ دو ٹکٹ عورتوں کے ڈبے میں بک کر اے گئے۔ دو ٹکٹ
میں نے اپنے ڈبے میں بک کر اے سان کے ماں باپ انہیں چھوڑنے کے
لئے اسٹیشن آئے۔ میرے کمر ماں باپ مجھے وہ اپنی ہیلی کے ساتھ تھیں میں اپنے
دوست کے ساتھ۔ اور اس طرح باہمی اصولوں کے درمیان گاڑی پونا روانہ ہوئی۔
اور پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو گاڑی سے نیچے اتار دیا اور کہا کہ وہ اب سیدھا
گھر چلا جائے اور انہوں نے اپنی ہیلی کو خیر باد کہا۔ اور پھر ہمارا دوست اودان کی

ہیلی اسٹیشن سے رد مال ہلتے ہوئے ہمیں دیکھتے رہے اور ہماری گاڑی آگے نکل گئی۔ پھر ان دونوں نے منہ میڈیا اور میں نے دیکھا کہ میرے دوست کا ہاتھ ان کی ہیلی کے ہاتھ میں گویا عشق کی بساط اور اسٹیشن ہی پر بچھائی جانے لگی تھی۔ خیر صاحب ہمیں کیا۔ کوئی مرے کوئی جئے، مگر صاحب بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ کیا کہ سر باز دینی اسٹیشن ہی پر آپ یوں عاشقہ شردرا کر دیں۔ میں اپنے دوست کو اتنا برا نہیں سمجھتا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ ان کی ہیلی اس قدر چھوڑی اندھستی ہو گئی۔

ہم اپنی سیٹوں کے اوپر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ چاروں طرف نگاہ ڈرائی۔ ایک طرف اندازہ تھا جو باہر غلام گردش کی طرف کھلتا تھا۔ آنے والے دوسرے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے نیچے چھوٹی سی تپائی تھی، اندر اور چھت کے قریب رکیوں میں اسب بار کھا ہوا تھا۔ اور کھڑکی سے باہر ریلوے کی لائن اور لکڑی کے بوسیدہ شید، نیلی اور لال بتیاں اور انسانوں کے گھر بندے اور جوہڑ اور کارخانوں کی چالیں اور کنوئیں نظر آ رہے تھے۔ غرضیکہ منظر بہت دل فریب تھا۔

میری محبوبہ نے اپنے ہونٹوں پر سرخی لگاتے ہوئے کہا: پیارے گرچو، مہی چھوڑتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

واقعی میں نے جھینپ کر کہا۔ جھینپ اس لئے کہ اس نے سب کے سامنے مجھے گرچو کہا۔ اب بتائیے گرچو سچی کوئی پیار بھرا نام ہے؟ چڑیا گھر کے کسی پرانے بوسیدہ گھر کے مڑے مچھ کا نام معلوم ہوتا ہے۔ پچا بھی آدمی خلوت میں گرچو کہہ دے۔ یہ سب کے سامنے گرچو، کہنا تضحیک نہیں تو

اور کیا ہے۔ بہتیرا سمجھا چکا ہوں۔ مگر مانتی ہی نہیں ہیں۔ کہتی ہیں مجھے اچھا لگتا
تھیں اس کے کیا!

میں نے چند آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا کچھ لوگ مسکرا رہے تھے۔ ایک
بڑھی کھوسٹ انیگلو آئین عورت نے نقلی دانتوں کی نمائش کی۔ اور اپنے سائے
جو خوفناک موٹھوں والا پارسی بیٹھا ہوا تھا وہ صاف کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں یہ بھو
جان چکا تھا کہ وہ کافی عرصہ سے میری محبوبہ کی طرف گھور رہا ہے۔ یہ میں مانت
ہوں کہ میری محبوبہ خوبصورت ہے۔ گورا چٹا رنگ ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں
قد لمبا ہے، مکرچلی ہے۔ سنہلی میں دلکشی ہے، چال میں جاذبیت ہے۔ بالوں میں
سنہرا پن ہے۔ باتوں میں معصومیت ہے۔ مثالی محبوبہ کے سائے اوصاف
اس میں موجود ہیں۔ لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹھاک جاتے ہیں ایک تو اس لئے کہ وہ
اس قدر خوبصورت ہے دوسرے اس لئے کہ وہ کس کے ساتھ چل رہی ہے،
انہیں اس کی خوبصورتی اور میری بدصورتی دونوں پر تعجب ہوتا ہے۔ اور یہ تعجب
اور بڑھ جاتا ہے جب وہ دونوں کو یوں ساتھ ساتھ دیکھتے ہیں۔ مگر یہ ایک لمحہ
کے لئے دیکھنا گھوڑنا اور حیرت میں آ جانا اور پھر الگ ہو کے اپنے کام پر چلے
جانا تو مجھ میں آتا ہے، مگر یوں برابر متواتر مسلسل گھوٹے جانا مجھ میں نہیں آ سکتا
بدقیسی میں شامل ہے جی صاف بات تو یہ ہے، اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ
مجھے لوگوں کا یوں میری محبوبہ کی طرف بار بار گھوڑنا بالکل پسند نہیں۔ مگر نہ جانے
کیا بات ہے کہ میری محبوبہ کو لوگوں کی یہ تاک جہانک بے حد پسند ہے۔ بہت
خوش ہوتی ہیں۔ اٹھانے لگتی ہیں۔ ہونٹوں پر سرخی لگانے لگتی ہیں، سارے کا
پکوسنوار نے لگتی ہیں۔ ہرانا سے دیکھنے والے کو اپنی طرف اور بھی متوجہ رکھنا
چاہتی ہیں۔

میں نے سرگوشی میں کہا : وہ خوفناک مونچھوں والا پارسی تمہیں گھور رہا ہے ۔

تمہیں یوں ہی شبہ ہو رہا ہے ، اُس نے دیکھے سروں میں کہا : اور اس گمی مونچھیں تو بالکل خوفناک نہیں ہیں ، بڑی پیاری ہیں ، آخری فقرہ اُس نے ذرا سا بلند لہجہ میں کہہ دیا ۔ پارسی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا ۔

میں نے کہا : میں اسے جان سے مار دوں گا ۔

وہ خوش ہو کر بولی : گرچہ تو تمہاری تو خواہ مخواہ رٹنے کی عادت ہے کوئی ہمیں پٹا گھورا کرے تمہیں اس سے کیا ۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرا ہات پٹنے بات میں لے لیا اور ہم لوگ تختہ دانہ انداز سے باہر دیکھنے لگے ، جہاں تین لڑکے ریلوے لائن کے سامنے کھڑے کھڑے پیشاب کر رہے تھے ۔

ہم دونوں نے اپنی نظریں جھکا لیں ۔ میں کھانسنے لگا ۔ وہ ہنسنے لگی ۔ کرجت کے پاس پہلی لمبی سڑنگ آئی ۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے ، اور توس کا نوالہ اس کے منہ میں تھا ، کہ گاڑی سڑنگ میں داخل ہوئی اور ایک دم اندھیرا ہو گیا ۔ اور وہ زور زور سے چیخنے لگی ۔ ہائے کیا ہو گیا ؟ ہم کہاں آگے ؟ ہائے میری ماں ۔ ہائے میرے باپ ۔ پیالہ ان کے ہات سے چھوٹ کر گر پڑا ۔

میں نے کہا : اے گھبراتی کیوں ہو ۔ یہ تو سڑنگ ہے ۔ گاڑی سڑنگ میں سے گزر رہی ہے ۔

تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ، تم مجھے ہمیشہ یوں ہی پریشان کرتے ہو ۔ بیوقوفان کہیں کے ۔

میں چپ رہا ۔ گاڑی سڑنگ میں سے گزرتی رہی ۔

”یہ سرنگ کبھی ختم نہیں ہوگی“۔ وہ غصہ میں بولی، مسیکر ذہن میں وہ سرنگ کی تاریکی میں ملفوف ہوئے رہنے لگے۔ مگر میں چپ رہا۔

میں نے کہا: ”بڑی لمبی سرنگ ہے“

”بھاڑ میں جلے سرنگ۔ مجھے تو روشنی میں سفر کرنا اچھا لگتا ہے“
جب سرنگ ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا، کہ چائے کا پیالہ ٹوٹا ہوا ہے اور چائے پارسی کی پتلون پر گر چکی ہے اور وہ اسے رومال سے پونچھ رہا ہے۔
میری محبوبہ نے اپنے رومال سے اس کی پتلون کے گھٹنے کو صاف کرنے کی کوشش کی اور کہا: ”بہت افسوس ہے“

خوفناک مونچھوں والے پارسی کا غصہ فرو ہو گیا۔ وہ میری محبوبہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا: ”نہیں نہیں کوئی بات نہیں تم بہت خوفزدہ ہو گئی تھیں“

”ہاں میں سرنگ میں سے پہلی بار گزری ہوں نا“۔ وہ مسکرائی

”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں“

میری محبوبہ نے اپنا نام بتایا۔ اس کا نام پوچھا۔ اور وہ دونوں باتوں میں اس قدر مشغول ہو گئے کہ میں پھر اکیلے کا اکیلا رہ گیا۔ گاڑی اوپر جا رہی تھی، چکر کاٹی ہوئی۔ اور واہیاں نیچے گھوم رہی تھیں جن میں دھان کے کھیت پہلے رہے تھے۔ اور دھان کے کھیتوں کے ایک طرف ایک چھوٹا سا گاؤں تھا کھلونے کی طرح معصوم اور اتنا ہی ننھا پیارا سا۔ اتنی بلندی سے ہر چیز کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے میرے منہ سے نکل گیا۔ واہ واہ کس قدر خوبصورت منظر ہے۔

محبوبہ نے پلٹ کر پوچھا: ”کیا کہاں کدھر، مجھے بتاؤ“

مگر وہ دادی اب نظروں سے گم ہو چکی تھی۔ میں نے کہا: وہی
خوبصورت دادی تھی جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اب ان پہاڑوں کی
ادٹ میں آچکی ہے۔

”تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا“

”تم باتوں میں مشغول تھیں اس قدر“

”تو کیا تم چاہتے ہو میں کسی سے باتیں بھی نہ کروں“

”یہ میں نے کب کہا ہے؟“

”میں اندھی ہو جاؤں۔ گونگی ہو جاؤں یہی چاہتے ہونا تم“

”یہ میں نے کب کہا“

”اچھا تو تو۔۔۔ ہم کسی سے بات نہیں کریں گے“

وہ منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ میں غصے میں تھا۔ چپ رہا، اور اندر ہی اندر سوچا:

تاب کھا تا رہا۔ پارسی مجھے غصہ سے تکتا رہا۔ اور اس کی مونچھوں کے نیکیلے کنارے

بچھو کے ڈنک کی طرح کانپتے رہے۔ پھر میں نے اپنا ہات اپنی محبوبہ کے نازک

ہات پر رکھا۔ اُس نے زور سے جھٹکا دیا۔ اُس کے شانے پر رکھا۔ اُس نے

اُہستہ سے الگ کر دیا۔ اُس کی کمر میں ڈالا۔ اُس نے وہیں رہنے دیا۔ ہم دونوں

باہر دیکھنے لگے۔ سامنے گھاٹ کی سبز چوٹی پر سے پانی کی دھار چیر کر نیچے آ بشار

کی صورت میں بہہ رہی تھی۔ وہ آ بشار ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بہہ

رہے تھے۔

”وہ دیکھو آ بشار“

”کہاں“

”وہ۔۔۔۔۔ سامنے پہاڑ پر، کس قدر اچھا معلوم ہوتا ہے آ بشار“

”وہ تو پانی نیچے گر رہا ہے۔“

”ہاں۔“

”تو پھر اسے آبخار کیوں بولتے ہیں۔“

”جب پانی یوں بلبند ہی سے گرتا ہے اُسے آبخار کہتے ہیں۔“

”اور اس روز جب اُس اونچے اسٹول پر سے تم نے پانی نیچے گرا دیا تھا

تو اسے بھی آبخار کہیں گے کیا؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا

اور میرا جی جل کے کباب ہو گیا۔ مگر میں چپ ہو گیا۔ گاڑی اس گے چلتی گئی ایک دکش موٹر پر سے گزری سیاہ کھڑکی کے سامنے جھاڑی پر لاکھوں جگنو ٹمٹا رہے تھے اور ان جگنوؤں کے اوپر بادلوں کی روائے لطیف تھی۔ ان جگنوؤں کی طرف دیکھنا میں نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا: ”ایک ہی جھاڑی میں گویا سارے آسمان کے ستارے سمٹ آئے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ بولی

”ستارے جگنوؤں کی طرح نہیں ہوتے؟“ میں نے پوچھا

”ہیں تو ہسی۔ مگر آسمان تو بہت بڑا ہے اور جھاڑی اتنی سی ہے۔“

”میں نے جھلا کر کہا: ”تم نہیں سمجھو گی۔“

”تم سمجھاؤ نا۔“ وہ بولی

”میں نے کہا: ”آسمان پر ستارے جیسے جھاڑی میں جگنو۔“

”یہ جگنو کیا ہوتے ہیں؟“

”تم نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے؟“

”کہاں دیکھتی ہمارے بھئی میں تو ہوتے نہیں۔ چڑیا گھر میں

بھی نہیں ہیں۔“

میں نے کہا : "جگنو چڑیا گھر میں نہیں ہوتے"۔

تو پھر کہاں ہوتے ہیں ؟ " اس نے پوچھا

یہیں جھاڑیوں پر " میں نے چلا کر کہا

چلاتے کیوں ہو " وہ غصہ میں بولی : "خود کو کچھ آتا نہیں۔ دوسرے کو بتا نہیں

سکتے۔ خواہ مخواہ چلانا شروع کر دیتے ہو " وہ روٹھ گئی

میں نے اُسے مناتے ہوئے کہا : "سوری ڈار لنگ۔ بات یہ ہے کہ یہ جگنو بڑا

چمٹو ماسا جانور ہے۔ یہ دن کو نظر نہیں آتا۔ رات کو چمکتا ہے اس کی دم

میں روشنی ہوتی ہے "۔

اں سمجھ گئی " وہ بولی : "جیسے ہماری موٹر کار کے پیچھے کی روشنی ہے نا۔ وہ بھی رات

کو چمکتی ہے "۔

بہت خوب " میں نے خوش ہو کر کہا : "تم کس قدر عقلمند ہو "۔

وہ بے حد مسرور ہو کر میرے کان میں کہنے لگی : "اگلی سڑنگ میں ممقیں اجازت ہوگی

مگر صرف ایک بوسہ "۔

اگلی سڑنگ ابھی بہت دور تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد آئے گی۔

وہ پاری میری محبوبہ کو برابر گھور رہا تھا۔ یہ سب کبھی کبھی اُسے کامراں نظروں سے دیکھ

لیتی۔ میں غصے سے دانت پس کر رہ جاتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بچہ جی کے اتنے

محبوب نے ماروں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ مگر ڈانی جھگڑے کو خلافت تہذیب

سمجھ کر چپ ہو گیا۔ میری محبوبہ نے دسویں بار شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ اور غارہ

دلپاشک ٹھیک کیا۔ اور ساڑھی کے پلو کو سینہ پر ٹھیک کیا۔

سامنے پہاڑی پر کسی مرے سردار کا پانا قلعہ تھا۔ جس کی جید دیواروں کے کھنڈ

صدیوں کے جنگ و جدال کی یاد دلاتے تھے۔ جب لوگ بہا درمی سے دیکھ

رہتے تھے۔ اور جو زیادہ بہادر ہوتا تھا وہی جیت جاتا۔ قلعے کی دیواریں دور
تک اونچی چٹانوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی بڑھتی قلعے کے چاروں طرف چلی گئی
تھیں قلعے کے نیچے چاروں طرف کھائی تھی۔

میں نے کہا : "وہ قلعہ دیکھو پہاڑ کی چوٹی پر کتنا خوب صورت ہے"
وہ قلعہ دیکھتی رہیں۔ دیر تک اس خبر بولیں : "اس میں کون رہتا ہے ؟"
مجھے کیا معلوم ؟ "میں نے جواب دیا

وہ بولیں : "جو بھی رہتا ہوگا۔ اُسے بڑا ڈر لگتا ہوگا نا ؟"
"کیوں ؟"

"دیکھو نا چاروں طرف خشک اور کھائی ہے۔ اور قلعہ بالکل پہاڑ کی چوٹی پر ہے
یہاں تو آدمی دو ہی دن میں گھبرا کے مرجائے۔ نہ گلیاں ہیں۔ نہ بازار۔ نہ سینما،
نہ تماشا۔ نہ ٹرامیں ہیں۔ نہ بس"

قلعہ پیچھے رہ گیا۔ گاڑی آگے چلی گئی۔ اب بادلوں کے مرغوعے کے مرغوعے
اس کے لئے لگے کیونکہ گاڑی کھنڈالہ کی سرطندیوں کو چھو رہی تھی۔ اور مون سون
ہواؤں کے دل بادل گاڑی کو چھو رہے تھے۔ ہوا میں ایک عجب تازگی اور
جاں بخش خنکی سی آچلی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بادل اندر ڈبے میں آنے
لگے۔ نازک سی دھند بن کر۔

میں نے کہا : "بادل تمہاری چاند سی جبیں کو چھو رہے ہیں"

"کھڑکی بند کرو" اس نے کانپ کر کہا

"کیوں"

"مجھے سر دی لگ رہی ہے" وہ نودے چپٹکی : "عجب موسم ہے یہاں کا یا تو
ابھی دھوپ تھی اب پھر چپٹک کر آیا ابھی بادل ہیں۔ چاروں طرف — آسمان

کھڑکی بند کر دو۔ مجھے زکام ہو جئے گا۔

میں نے بادل نا خواستہ کھڑکی بند کر دی۔ اور دل میں سوچا۔ اب اس سفر پر بھی محبوبہ کو ساتھ نہیں لےؤں گا۔ سارا مزہ کر کر اکر دیا اس کم بخت عورت نے۔ یعنی بات کی لطافت تک جاتی ہی نہیں۔

اس نے اپنے ننھے سے رومال سے اپنی ننھی سی ناک صاف کی۔ پھر غازیہ اپڈر سرخی کو چہرے پر شیشہ سالنے لگا کر استعمال کیا۔ اور سارے ہی کی شکلوں کو دست کیا۔ اور مونچھوں والے پارسی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور مجھ سے ذرا الگ ہو کے بیٹھ گئی۔

اتنے میں وہ سرنگ آگئی۔ اور میرے ذہن میں وہ تاریکی میں ملفوف بوسوں کا خیال آیا۔ اد میں آہستہ آہستہ تاریکی میں اپنی محبوبہ کی طرف جھکنے لگا۔ آہستہ آہستہ سانس روکے ہوئے تاکہ اُسے پتہ نہ چلے۔ اتنے میں گرم گرم سانس کی حدت مجھے اپنے گالوں پر محسوس ہونے لگی۔ اور محبوبہ کے ہونٹ قریب آ رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کے فوراً ہی اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا دیئے۔ پھر فوراً ہی الگ کر دیئے۔ کیونکہ وہاں تو خوفناک مونچھیں تھیں۔

سرنگ چھوٹی تھی۔ میں گھبرا یا ہوا جلدی سے اپنی سیدٹ پر بیٹھ گیا۔ دیکھا، پارسی بھی اپنے کپڑے دست کر رہا تھا۔ مجھے برا غصہ آیا۔ یہ کم بخت سرنگ کی تاریکی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اٹھ کے اُسے ایک گھونسا رسید کر دیا، اُس نے مجھے جواب میں زناٹے کے دو دو ہتھکڑیوں کے کئے کہ میں بوکھلا سا گیا۔ میری ناک سے نکسیر کی دھار پھوٹ پڑی۔ اب اس پر میری محبوبہ کو جو اس پارسی پر غصہ آیا۔ تو اُس نے اپنی چھوٹی سی چھتری اٹھا کے اُسے وہ پٹا وہ پٹا کہ بے چارہ بالکل حیران و ششدر رہ گیا۔ آخر لوگوں نے اور خاص طور پر اس بدھی کھوسٹ انیگلو انڈین

میم نے یسح بی ذکر کے سب کو الگ کیا۔ بہت شور و غل رہا اور میری محبوبہ نے اس پارسی کو بہت گالیاں دیں۔ اور پھر وہ مجھے ہاتھ روم میں لے گئی، جہاں اس نے میرے سر پر پانی ڈال کر میری نکیر بند کی۔ تو لٹے سے میرا سر پوچھا۔ منہ پوچھا اور مجھے واپس اپنی سیٹ پر لے آئی۔ اور میرے سر کو اپنے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ کتنا مزہ ہے اس پیار میں جب صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ اور وہ پارسی شکست خوردہ ہو کے بیٹھا تھا۔ سر جھکا لے ہوئے۔ اور گاڑی پوتا کے میدانوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اور میری ناک سرخ تھی۔ اور میری محبوبہ کا ہاتھ میرے سر پر تھا۔ اور وہ مجھے پیار سے تھپکا رہی تھی۔

انیکو انڈین بڑھیا بولی: "تم دونوں کا بنیاد بیاہ ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے" نہیں تو "میری محبوبہ بولی: "بیاہ ہونے والا ہے" میں خوشی اور مسرت سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑھی میم پارسی سے بولی: "جب تو تمہیں ہات جوڑ کے معافی مانگنی چاہئے۔"

پارسی نے شرماتے ہوئے کہا: "آپ دونوں مجھے معاف کر دیں۔"

محبوبہ نے کہا: "آؤ ہم سب دوست بن جائیں۔"

پھر میری محبوبہ نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ میرا گر چھو ہے۔"

میں نے کہا: "اودیہ میری گر چھی ہے۔"

پارسی بولا: "اور خاکسار کو گر چھی کہتے ہیں۔"

میرا بچہ

یہ میرا بچہ ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے یہ اپنی ماں کے سینوں میں تھا۔ میری متدو تیز جنسی خواہش میں سو رہا تھا جیسے درخت بیج میں سویا رہتا ہے۔ مگر آج سے ڈیڑھ برس پہلے اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ حیرت ہے کہ اب اسے دیکھ کر اسے گلے سے لگا کر اسے اپنے کمرے پر ملا کر مجھے اتنی راحت کیوں ہوتی ہے۔ بڑی عجیب سی راحت ہے یہ۔ یہ راحت اس راحت سے کہیں مختلف ہے۔ جو محبوب کو اپنی باہنوں میں لٹالنے سے ہوتی ہے۔ جو اپنی مرضی کا کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ جہاں کی آغوش میں پھسل جانے سے ہوتی ہے،

یہ راحت ایک بڑی عجیب سی راحت ہے۔ جیسے آدمی یکا یک کسی نئے
جزیرے میں آ نکلتے کسی نئے سمندر کو دیکھ لے۔ کسی نئے افق کو پہچان لے
میرا بچہ بھی ایک ایسا ہی نیا افق ہے۔ حیرت ہے کہ ہر پانی چیز میں ایک
نئی چیز کوئی رہتی ہے اور جب تک وہ جاگ کر سر بلند نہ ہو لے کوئی اس
کے وجود سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یہی تسلسل مادے کی بنیاد ہے۔ اس
کی ابدیت کا مرکز ہے۔ اس سے پہلے میں نے اس نئے افق کو نہیں دیکھا
تھا۔ لیکن اس کی محبت میرے دل میں موجود تھی۔ میں اس سے آگاہ نہ تھا
مگر یہ میری ذات میں تھی۔ جیسے یہ بچہ میری ذات میں تھا۔ محبت اور بچہ اور
میں۔ تخلیق کے جذبے کی تین تصویریں ہیں۔

بچے سبھی کو پیار سے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے بھی اپنا بچہ پیارا ہے، شاید
دوسرے لوگوں کے بچوں سے زیادہ پیارا ہے۔ اپنے آپ سے پیارا نہیں
مگر اپنے آپ کے بعد اور بھی کسی چیز میں ہیں۔ کئی جذبے ہیں۔ انا کی کتنی
ہی تفسیریں ہیں جن کے بعد یہ بچہ مجھے پیارا ہے۔ یہ تو کوئی بڑی عجیب اور
انوکھی بات نہیں ہے میں دن میں اپنا کام کرتا ہوں اور یہ بچہ مجھے بہت
کم یاد آتا ہے۔ اور جب یہ سامنے ہوتا ہے اس وقت بہت کم کام مجھے یاد
آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک نہایت ہی عام بات می ہے۔ ہر ماں اور ہر
باپ اس فطری جذبے سے آگاہ ہے۔ اس میں تو کوئی نئی بات نہیں لیکن
دنیا میں ہر بار کسی بچے کا معرض وجود میں آنا ایک نئی بات ہے۔ چاہے وہ
بادشاہ کا بچہ ہو یا کسی غریب لکڑہارے کا۔ ہر بچہ اک نئی حیرت ہے انسانیت
کے لئے۔ تہذیب کے لئے۔ حال کے لئے۔ مستقبل کے لئے۔ وہ ایک نیا
سہ۔ جس میں رنگ بھرا جائے گا جس میں نقوش اُبھارے جائیں گے

کے گرد سماج کا چوکھٹا لگایا جائے گا۔ اس خاکے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ دل میں تجسس اور تخیل میں اڑان پیدا ہوتی ہے۔ بڈے کو دیکھ کر تخیل پیچھے کودتا ہے بچے کو دیکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ بڈھا پرانا ہے۔ تو بچہ نیا ہے۔ ایک ماضی ہے تو دوسرا مستقبل ہے۔ لیکن تسلسلے ہوئے۔ تخیل کی ریل گاڑی اپنی دو سٹیشنوں کے درمیان آگے پیچھے چلتی رہتی ہے۔

کس قدر تجیرزا، عجیب و غریب نیا حادثہ ہے یہ بچہ۔ ایک تو اس کی اپنی شخصیت ہے۔ پھر اس کے اندر دو اور شخصیتیں ہیں۔ ایک اس کی ماں کی۔ دوسری اس کے باپ کی۔ اور پھر ان دو شخصیتوں کے اندر بخانے اور کتنی شخصیتیں چھپی ہوئی ہوں گی۔ اور ان سب نے مل کر ایک نیا خمیر اٹھایا ہوگا۔ یہ خمیر کیا ہوگا۔ ابھی سے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس بچے کو دیکھ کے جو اس وقت جا جا جا کہتا ہے اور پھر سنس کرانگوٹھا چوسنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ میں اتنا غور نہ ہاں ہوں کہ اس چہرے میں میرا خم ہے۔ میری ٹھوڑی ہے۔ وہی ہونٹ ہیں۔ وہی ماتھا ہے۔ بھولا اور آنکھیں ماں کی ہیں اور کان بھی، لیکن کوئی چیز یہی نہیں۔ ساری نہیں۔ مکمل نہیں۔ بس ملتی جلتی ہوئی۔ ان سب کے پس پردہ ایک نیا پن ہے۔ ایک نیا انداز ہے۔ ایک نئی تصویر ہے۔ یہ تصویر میں اندھم اے حیرت سے تک رہے ہیں شاید اس کے اندر ہندو کچھ اور ہندو کا مزاج موجود ہوگا۔ باپ کا غور اور ماں کا بھولا پن موجود ہوگا۔ لیکن ابھی سے میں کیا کوئی بھی کیا کہہ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں۔ یہ ایک نئی چیز ہے۔ جیسے اٹم کے ذہنی ذرے مختلف انداز سے مل کر مختلف وحائیں بن جاتے ہیں۔ کوئی اس بچے کے متعلق بھی کیا کہہ سکتا ہے۔

جہاں انسان ہر نئی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے وہاں وہ ہر نئی چیز میں اپنی جانی پہچانی چیزیں ڈھونڈ کر اسے پرانا بنا رہتا ہے۔ یہ عمل ہر وقت جاری رہتا

ہے۔ شاید میں بھی اپنے بچے میں اپنے مطلب کی تصویریں دیکھتا ہوں۔ اور ان میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ دنیا میں بستے خاکے اسی طرح بھسکے جاتے ہیں اور ماضی اور حال اور مستقبل کی اسی طرح تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ بوتلیوں رنگوں سے اس بچے کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ کچھ رنگ آمیزی کرتا ہے۔ کچھ ماں باپ کرتے ہیں۔ کچھ اس کی اپنی مخفی شخصیت بروئے کار آتی ہے اور اس طرح یہ تصویر مکمل ہوتی جاتی ہے۔ مگر کبھی پوری طرح مکمل نہیں ہوتی کیونکہ موت کی سیارہ بھی تو ایک رنگ ہی ہے۔ انسان کی تقدیریں اور اس ساری کائنات کی تقدیریں آخری بارش آج تک کسی نے نہیں لگایا۔ ارتقاء کی آخری کڑی کوئی نہیں ہے۔ حیرت بڑھتی جاتی ہے۔

لیکن رنگ آمیزی کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہو گئی۔ اس خاکے میں رنگ بھرا جائے گا اب۔ جب یہ رویا تھا اور آیلنے اسے شہد چٹایا تھا تو برش کی پہلی جنبش معرض عمل میں آئی تھی۔ پھر اس نے کپڑے پہنے۔ اور اس کے کانوں میں وید منتر پھونکے گئے۔ اور ماں نے پنجابی زبان میں لوری سنائی۔ اور باپ نے ہنس کر انگریزی زبان میں اس سے بات کی اور باپ کے مسلمان دوست اسے اپنے سینے سے لگائے لگائے گھومے۔ یہ تصویر کہیں گزرتا تو نہ ہو جائیگی ماضی پرانا ہے۔ لیکن حال نا آسودہ ہے۔ مستقبل کیا ہوگا۔ یہ بچہ کدھر جا رہا ہے۔

سوال کوئی نیا نہیں۔ ہر صدی میں اہر برس میں۔ ہر ماہ میں۔ ہر روز ہر لمحہ یہی سوال انسانیت کے سامنے پیش آتا ہے۔ یہ نیا لمحہ جحافت کے پہلا رنگ کے سامنے موجود ہوا ہے، کیا ہے۔ کس کی عنایت کر رہا ہے۔ تاریخ کے کس لمحے کا منظر ہے۔ اس آگ کو ہم کیسے باز رکھ سکتے ہیں۔ اس شعلے کی تربیت کیوں ممکن ہے۔ عام لوگوں کے لئے امام دین احمد گنگا رام کے لئے شاید یہ سوال اہم نہیں ہے

اسلام دین کا بیٹا فتح دین ہو گا۔ اللہ گنگا رام کا سپوت بننا رام ہو گا۔ یہ دعا سدا
 دستور یہ ہے کہ ہر نئی چیز کو ماضی کے ساتھ جکڑ دیا جائے۔ نہایت آسان بات
 ہے۔ کیونکہ ماضی جانی بوجھی سوچی سمجھی ہوئی کہانی ہے۔ وہ آنے والا تجربہ نہیں
 گزرنے والا تجربہ ہے۔ ایک ایسا مشاہدہ جو تمہیں کو پہنچ گیا۔ جس کی نیکی بدی کی
 حدود انسانی اداک کے جغرافیے میں درج کر دی گئی ہیں۔ یہ کام سب کے آسان ہے
 اور دنیا ہی کرتی ہے۔ اور حیرت اور سچائی اور نیکی اور ترقی کا شرب در روز خون
 کرتی ہے۔

شاید مجھے بھی یہی کرنا چاہئے۔ مگر ابھی تک تو یہ بچہ میرے لئے اتنا بڑا
 کہ میں اس خاک کے کو چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس کے نام ہی کو لے لیں۔ ہر روز
 اصرار ہوتا ہے۔ بیوی بھی کہتی ہے۔ احباب بھی پوچھتے ہیں۔ اس کا نام کیا ہے۔
 اس کا نام تو کچھ رکھو۔ میں سوچتا ہوں۔ اس کا نام؟ اس کا نام میں کیا رکھوں۔ پہلے
 تو یہی سوچتا ہے کہ مجھے اس کا نام رکھنے کا بھی کوئی حق ہے۔ کسی دوسرے کی شخصیت
 پر میں اپنی پسند کیسے جڑوں بڑی شکل بات ہے۔ بالفرض محال میں اس خاصیت
 بے انصافی پر ماضی بھی کر دیا جاؤں۔ تو اس کا نام کیا رکھوں۔ اس کی دادی کو شہرہ
 کی زناہم پسند ہے۔ اس کی ماں کو ولیپ سنگھ۔ میرے ذہن میں تین اچھے نام
 آتے ہیں۔ رجن۔ مسلم۔ ہنری۔ صوفی اعتبار سے یہ نام بڑے پیارے ہیں۔ کم از کم
 مجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن صوفی اعتقاد کے علاوہ سیاسی اور مذہبی
 الجھنیں بھی ان ناموں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں۔ کاش کوئی ایسا نام ہو جو ان الجھنوں
 سے الگ رہ کر اپنی شخصیت رکھتا ہو۔ رجن ہندو ہے۔ مسلم مسلمان ہے۔ ہنری
 عیسائی ہے۔ یہ لوگ ناموں کو اس قدر محدود کیوں کر دیتے ہیں۔ اس قدر کمینہ کیوں
 بنا دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ نام نہیں ہے۔ پھانسی کی رک ہے جو زندگی سے

موت تک بچے کے گلے میں لٹکتی رہتی ہے۔ نام ایسا ہو جو آزادی دے سکے۔ ایسا نہیں جو کسی قہم کی سیاسی مذہبی سماجی غلامی عطا کرتا ہو۔ پھر وہ نام کیا ہو۔ یہاں سہرہ ہمیشہ گھر میں اور دوست احباب میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ اد میں سوچتا ہوں۔ ابھی میں اس کا نام ہی کیوں رکھوں۔ کیوں نہ اسے خود موقعہ دوں کہ بڑے ہو کر یہ اپنا نام خود تجویز کرے۔ پھر چاہے یہ اپنا نام مٹرا رام۔ کوئل گندھاریا عبد شکور رکھتا پھرے۔ مجھے اس سے کیا واسطہ۔

برشس تذبذب میں ہے کہ کون رنگ بھرے۔ نام کو چھوڑیے۔ مذہب کو لیجئے۔ ہندو کچھ میں ڈوبا ہوا گھر بیٹے کو اسی رنگ میں رنگے گا۔ اسلامی کچھ کا فرزند ضرور مسلمان ہو گا۔ یعنی ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ مگر یہ تو بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ کہ آپ نے بچپن برس تک اپنے فرزند کو ایک اپنے ہی پرانے ڈھکے پر چلانے کی کوشش کی۔ اور اس کے بعد یکایک خیالات نے جو بیٹا کھایا۔ تو ہندو مسلمان، مسلمان عیسائی اور عیسائی کیونسط ہو گیا۔ اعتقادات زندگی کے دیکھنے سے بنتے ہیں نہ کہ دماغ پر ٹھونسنے سے۔ یعنی کون سا طریقہ بہتر ہے اب تک تو دوسرا طریقہ رائج ہے۔ یعنی زبردستی ٹھونسٹھاٹھانس۔ اور اس کے بعد عادت ثانیہ۔ دادا ہندو۔ باپ ہندو۔ بیٹا ہندو۔ پھر پہلے ایک قدم اٹھاتی ہے۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اور پھر اسی راستے پر اسی طرح انہیں قدموں پر چلتی جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ راستے میں دائیں طرف گھاس ہے۔ مکھن پایوں کے پھول ہیں۔ بائیں طرف چیل کے درخت ہیں۔ راستے میں چٹانوں پر خوش امان طیسہ اپنے رنگین پروں کو سنوارے بیٹھے ہیں۔ فضا میں نشے کی بارش ہے۔ آسمان پر بادلوں کے پر زیاد ہیں۔ نہیں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ بس پھر کے لئے تو قدموں کی مسلسل زنجیر ہے۔ دادا مالک کا چاکل۔ ہر بیٹا اپنے باپ کا چاکل کھاتا ہے

ادھر پھر کی طرح پرانے راستے پر چلتا جاتا ہے۔ تو پھر تے راستے کیسے دریافت
ہوں گے۔ ادھر ہر پانی منزل کو چھوڑ کر ہم نئی منزل پر کیسے گا مسزن ہو سکیں گے،
شاید مجھے اس چابک کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

اچھا نام ادھر مذہب کو بھی گولی مارے۔ آئیے ذرا یہ سوچیں کہ اس کا
ملک ادھر اس کی قوم کیا ہے۔ ماضی پر جائیں تو یہ کوئی فصل بات نہیں ہے۔
یہ بچہ ہندوستان میں پیدا ہوا اس لئے ہندوستانی ہے۔ شمالی ہند کے ماں
باپ کا بیٹا ہے۔ اس لئے آریائی قوم سے منسوب کیا جانا چاہئے۔ ٹھیک ہے
دنیا میں ہر جگہ یوہنی ہوتا ہے۔ ہوتا آیا ہے۔ دیر تک ہوتا رہے گا۔ مگر میں سوچتا
ہوں کہ ہر لمحہ جو نیا بچہ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس تحیرنا امر پر اس سے گہرے
غور و خوض کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی کیا قوم ہے۔ کون سا ملک ہے
اسیہ لوگ شاید وسط ایشیا کے آئے تھے۔ رگوں میں منگول اور کیائی خون
کی آمیزش نے ہوئے۔ پھر یہاں پہنچے تو درازد قوم میں گڈ مڈ ہو گئے۔ پھر
مسلمان آئے تو رگوں میں سامی خون بھی موجزن ہو گیا۔ ادھر اب یہ کیا قوم ہے
کون سا ملک ہے۔ یہ ہندوستان۔ اس میں ترکستان بھی ہے۔ روس بھی ہے
چین بھی ہے۔ ایران بھی ہے۔ ترکی بھی ہے۔ عرب بھی ہے۔ یوہ بھی ہے
ادھر اب پاکستان بھی ہے۔ یہ خون۔ یہ قوم۔ یہ ملک، کس قدر جھوٹی اصطلاحیں
ہیں۔ انسان نے خود اپنے آپ کو جان بوجھ کر ان زنجیروں سے باندھ رکھا ہے
لیکن مجھے تو اپنا بیٹا بہت پیارا ہے۔ میں اُسے دیدہ و دانستہ ان زنجیروں
میں کیسے جکڑ سکتا ہوں۔

برش اُسی طرح جامد ہے۔ ابھی اس خاکے میں ایک رنگ بھی نہیں بھر کا
تعمیل کوئی دوسری ماہ اختیار کرے ادھر یہ سوچے کہ اس کی تعمیل و تربیت کیا ہو

تو یہاں بھی عجیب پچیدگیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اسکو لوں اللہ کا بچوں میں جو تعلیم ہے وہ بھی ماضی سے اس قدر بندھی ہوئی ہے کہ کسی نئے تجربے کی کمی نہی حیرت کی گنجائش نہیں کیا میں اُسے وہ تاریخ پڑھاؤں جو انسانوں کے دریا نسلی منافرت اور مذہبی بد اعتمادی پھیلاتی ہے۔ یہ تاریخ جس میں پادشاہوں کی زنا کاریوں کے قصے ہیں۔ اور بے وقوف ذبیروں کے قصیدے ہیں۔ یہ جغرافیہ جس میں قطب شمالی اور قطب جنوبی کا صحیح حدود اور بے تک نظر نہیں آتا۔ یہ اب جس میں ادبائش امیریں اور شہزادی شاعروں کی عشقیہ داستانیں ہیں۔ یہ اقتصادیات جسے سرمائے کی ماہیت کا علم نہیں۔ یہ ریاضیات جس میں ایک گھنٹہ ایک گھنٹہ میں دو میل چلتا ہے (تو چوبیس گھنٹے میں کتنا چلے گا، یہ جاہل بے خبر علم و فن جو ہمارے اسکو لوں اللہ کا بچوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ زمانہ حال سے کتنے دور ہیں۔ یہ مبلغ علم ایک سو سال پرانا ہے۔ لیکن میرا بچہ تو نیا ہے۔ کیا اسے پڑھالے کے لئے ایک پوری قوم کو درس حیات دینا پڑے گا۔

شاید یہ ممکن نہیں لیکن یہ تو ممکن ہے کہ میں اس کا کوئی نام نہ رکھوں کوئی مذہب نہ رکھوں۔ اسے کسی قوم سے، کسی ملک سے منسوب نہ کروں۔ اسے صرف اتنا کہ دوں، کہ بیٹا تو انسان ہے۔ انسان اپنے خیر کا۔ اپنی تقدیر کا۔ اپنی زمین کا خود خالق ہے۔ انسان، قوم سے، ملک سے، مذہب سے بڑا ہے۔ وہ اپنی روح تمسید کر رہا ہے۔ تو ہم سے نیا ہے۔ اپنی جدت سے اس روح کو نئی سر ملیندی عطا کر، تیرے اور میرے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہے۔ تیرے اور میرے درمیان صرف محبت کا رشتہ

ہے، جیسے مسند لہرے، اللہ آگ شعلے سے اللہ ہوا جمونکے سے ملتی ہو
 اسی طرح میں اللہ تو اس دنیا میں آگے مل گئے ہیں۔ اور ماضی سے حال
 اللہ حال سے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔

بچہ انگوٹھا جو سہا ہے۔ اللہ میری طرف حیرت سے دیکھ رہا

ہے۔

انجیر

سیاتے بہت پر انہاں پٹھی گاؤں تھا۔ اور ایک اونچے ٹیلے پر آبا و تھا۔
 ٹیلے کے نیچے سے ندی گذرتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ بالکل سوکھی تھی، اس
 کی تہ میں بھوری بھوری مٹی میں کالے کالے پتھر چپکے رہے تھے۔ پتھر جو کبھی
 نیلے، مٹیالے یا صبح کے رنگ کے ہوں گے۔ مگر اس وقت بالکل سیاہ
 تھے۔ ایک آوارہ گدھا گھاس کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا
 تھا۔ نمازت آفتاب سے ساری زمین ہانپ رہی تھی۔ پرانی اسلامی مسجد کے
 پاس ناتراشیدہ پتھروں کا ایک گھر تھا۔ اس میں پیڑوں سویا ہوا تھا۔ پیڑوں
 اس کی بیوی جو جوانی میں ادھیر عمر کی دکھائی دیتی تھی اس کے خندہ خال میں
 مودی تناسب نمایاں تھا۔ پیڑوں کو رنگ بھی کسی زمانے میں تانبے کا سا

ہوگا۔ اس وقت سرسئی مائل تھا اس کے ماتھے کے شکنوں میں اور خالوں کے گڑھوں میں اور ٹھوڑی کی پوٹ میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے
رفکا ... رفکا ... اری اور رفکا ۔

لیکن رفکا خود سونا چاہتی تھی۔ وہ کچے فرش پر اوندھے منہ پڑی
تھی۔ اس کی موٹی موٹی ناگیں تنگی تھیں اور ان پر نیلی نیلی ویدیں ابھری
ہوئی تھیں۔ ٹخنوں اور پاؤں پر گد کی تھیں بھی ہوئی تھیں اور ناخن مموں کی
طرح موٹے تھے۔ اور پاؤں چپے چپے۔ چھوٹے چھوٹے سے پاؤں۔ لیکن
چپے۔ رفکا کے اچھے ہوئے بالوں میں جیسے کبھی کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ دھانے
ہات سے برابر نیکھا کئے جاتی تھی۔

رفکا نے اپنے خاند کی آواز سنی مگر وہ چپ رہی اور برابر اپنے چہرے
کے اوپر کاغذ کا پنکھا ہلاتی رہی۔

”اری اور رفکا۔ چھناں کہیں کی۔ حرافہ سنتی ہے کہ نہیں۔ پنکھا مجھے
دے۔ گرمی سے مر جا رہا ہوں۔“

رفکا نے سنی ان سنی کدی، اور برابر اپنے چہرے پر پنکھا ہلاتی
رہی اس کا چہرہ کسی زمانے میں بہت خوبصورت ہوگا۔ لیکن اب اس کے رخسار
پیلے پڑ گئے تھے اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے گڑھے تھے
اور ماتھے کا چھڑا دھندلا گیا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں اور پیروں کی جلد کانٹے
ہوئے چمڑے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ہاں اس کی لابی پلکوں کی صف
بستمد مدد نہ تھی۔ اس نے نیم واس آنکھوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ اور
کروٹ بدل کر پنکھا ہلاتی رہی۔

”تجھے نرا کبھی کے غصہ نہ دے اٹھائے جائیں“ پیڈو نے اسے یہ

موٹی گالی دی اور فرسش سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا : میں تو زمیندار کے باغچے میں جاتا ہوں سونے کے لئے۔

وہ پھوٹنے سے دروازے سے سر تھکا کے نکلا۔ باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا زمیندار کے باغ کی طرف چلا گیا۔ زمیندار کے باغچے کے چاروں طرف پتھروں کی دیوار تھی، کوئی تین فٹ اونچی، اندر باغچے میں پھول پھل پتی کچھ بھی نہ تھا۔ صرف زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ کھڑا رہ گیا تھا۔ جمہوری بغاوت کے دنوں میں زمیندار کا گھر بھگ گیا تھا۔ اور اس کی چھت تک اکھاڑ کر پینک ڈالی گئی تھی۔ باغچے کے عین اوپر زمیندار کا مکان اسی حالت میں کھڑا تھا۔ جگہ جگہ سے جلا ہوا۔ ٹوٹا ہوا۔ لوٹا ہوا۔ چھت غائب۔

زمیندار نے اپنے آبائی مکان کی مرمت کی طرف کوئی دھیان نہ دیا تھا۔ وہ سال میں دو مرتبہ گاؤں آتا تھا۔ ایک گاؤں کے مکینوں سے اپنا روپیہ وصول کر کے پھر واپس میڈرڈ چلا جاتا تھا۔ میڈرڈ کی روایتیں اُسے ہمیشہ اپنے پاس بلائے رکھتیں۔ گاؤں کی خوفناک تنہائی، گاؤں کے مکینوں کی کمبت گاؤں کے گھٹے گھٹے ماحول کا جس اُسے گاؤں میں چند دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیتا۔ اُس کے باغ میں ایک بڑھا چوکیدار رہتا تھا۔ وہ بہت بڑھا تھا اور بہت غریب تھا۔ اُس نے اُسے اپنی خانہ جنگی میں کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس وقت وہ زمیندار کے مکان کے تہ خانے میں سوتا تھا۔

باغچے کے ٹوٹے ہوئے پتھروں نے صدا دی۔ لیکن پیڈرو نے اس کی سختی سے چرخ چوں کی پرواہ نہ کی۔ اہل دروہا ہوا سیدھا اندر چلا گیا۔ وہیں ٹوٹی پڑی تختیں۔ ایک تنگی عورت کا بت نوروں کے پاس ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔

قواروں میں پانی نہ تھا۔ اور فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ پیڈر و سیدھا اندر چلا گیا۔ زیتون کے جھنڈ کی طرف، یہاں گھنا سایہ تو نہ تھا۔ لیکن پھر بھی خوشگوار سایہ تھا، اور زیتون کے چھوٹے چھوٹے پتوں میں ہونے والے چل رہی تھی۔ پیڈر و نے اس ہوا کی جاں بخش ٹھنڈک کو اپنے رخساروں پر محسوس کیا، اور اسے معلوم ہوا جیسے رفکا اسے پنکھا بھیل رہی ہو، اور اسے بہت جلد نیند آگئی، اور وہ خراٹے لینے لگا۔ اور اس کا منہ کھل گیا اور لب اس کے ہونٹوں کے کونوں سے گر کر زمین کو گیل کر گیا۔

تین سپاہی رانفلیس مقامے باغچے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنی رکھی تھی۔ وہ بہت مسرور تھے اور بڑے اہم کام کے آئے تھے۔ انھوں نے پہلے زیتون کے جھنڈ میں چھوڑے سائے تلے تھوڑی سی اور پی، اور پھر اونچی آواز میں زور زور سے گانے لگے۔ گیت وحشی اور نکما تھا۔ اس میں فسران کوئی تحریت تھی، اپنی فوج کی بہادری کی داستان تھی، اور جمہوری بغاوت اس کے نمایندوں کے لئے کو سننے تھے۔ وہ بڑے مزے میں دیر تک گاتے رہے اور پیتے رہے۔ پھر انھوں نے رانفل کے کندے سے سوئے ہوئے پیڈر و کو دو تین ضربیں رسید کیں، پیڈر و ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے؟ کیا ہے؟“ پیڈر و پریشان ہو کر بولا۔

وہ گانے لگے: ”وے! اس گانے میں تمہیں بھی شریک ہونا چاہیے۔ پیڈر و نے لمحہ بھر کے لئے توقف کیا۔ سپاہی بولے: ”گاتے ہو

کہ نہیں؟“

”گانوں گا۔“

”تو چپ کیوں ہو۔ گانو۔“

مجھے یہ گیت یاد نہیں ہے۔ تم گاؤ۔ میں مختار سے ساتھ ساتھ گاؤں گا۔
 نہیں تم خود گاؤ۔ گیت تمہیں یاد کیوں نہیں ہے۔ کیا تم کیونست ہو
 پیڈ بولا : میرا نام پیڈ ہے۔ میں ایک غریب کسان مزدور ہوں میرے
 سات بیٹے ڈائی میں کام آگئے تین رڈ کے جمہوری اسپینی فوجوں میں بھرتی
 ہو گئے۔ بٹا بیٹا اس سے چھوٹا بیٹا اس سے چھوٹا بیٹا۔ ادھر پھر سب سے
 چھوٹا بیٹا جو مجھے بہت عزیز تھا۔ یہ چار بیٹے فراکو کے سپاہی بن گئے مختاری
 طرح، اس طرح ڈائی میں میرے بیٹے کام آئے، اب میرے پاس ایک ہی بیٹا
 ہے۔ وہ ابھی بچہ ہے۔ سترہ برس کا ہوگا۔ میرا ننھا پیڈ : «

پہلے سپاہی نے کہا : نہیں تم کیونست ہو»
 پیڈ نے کہا : میں کیونست نہیں ہوں تم غلط کہہ رہے ہو»
 کون غلط کہتا ہے، تم یا ہم ؟ جلدی بولو» ایک سپاہی نے اُسے
 کندہ مار کے کہا

دوسرا بولا : حوا ہرا دہ کیونست ہے، اسے ماسکو پہنچا دو»
 تیسرا ہنس کے بولا : ماسکو جاؤ گے ؟ وہاں کھانے کو رب کچھ ملے
 گا۔ پہننے کے لئے کپڑا سبھی ملے گا۔ ادھر کام سبھی ملے گا»
 پیڈ بولا : جب تو میں ضرور جاؤں گا۔۔۔ اسے غصہ آنے لگا۔
 تیسرے سپاہی نے دوسرے سپاہی سے ہنس کر کہا : یہ ضرور جائے
 گا، اسے جلدی سے بھیج دو، اتنا کہہ کر وہ ننھا مار کر ہنس پڑے۔
 پہلے سپاہی نے دہشتی سے کہا : تو کھڑے ہو جاؤ»
 کاہے کو ؟ « پیڈ بولا۔

تمہیں ماسکو جانا ہے تاں اس لئے۔ اب کوئی حیل جھٹا نہ کرو فوراً

اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔

پیڈو حیرت اور پریشانی سے ان کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا دوسرے
سپاہی نے اُسے اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس باغیچے کی دیوار کی اس
طرف ماسکو ہے۔ ادھر اسپن ہے۔ تم ماسکو جانا چاہتے ہو نا۔ اس لئے اس
ٹکٹ سے نہیں اس دیوار کو پھلانگ کے چلے جاؤ۔
پیڈو بولا: تم تو مذاق کر رہے ہو۔

دوسرے سپاہی نے رنفل اٹھا کے کہا: جاتے ہو یا پھر کوئی
دوسری ترکیب بتائیں۔

پیڈو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دیوار پھلانگ ہی رہا تھا کہ تیرے
سپاہی نے اُسے گولی کا نشانہ بنایا۔ اور وہ مچلی کی طرح تڑپ کر دیوار
کے ادھر جاگرا۔ اور پھر نہیں اٹھا۔ گولی کی آواز دیر تک ٹیلے کے چاروں
طرف گونجتی رہی۔

گولی کی آواز سن کر باغ کا بڑھا مالی جاگ گیا۔ بھاگتا ہوا آیا۔ زیرتون کے
جھنڈ کے سائے میں تین سپاہی زور زور سے تھپتھپے لگا رہے تھے۔
کیا ہوا؟ بڑھا مالی بولا۔

تیسرے سپاہی نے کہا: میرے ابا۔ ایک کیونٹ تھا، اُسے
ماسکو پہنچا دیا ہم نے۔

بڑھے نے کہا: یہ تو پیڈو کی لاش ہے۔ اس کے بات پاؤں
نہیں گئے۔

دوسرا سپاہی بولا: اس کا گھر کہاں ہے۔ ذرا وہاں بھی خبر
دیں۔

بڑھے نے رندھے ہوئے گئے سے کہا: یہ تو پیڑرو کی لاش ہے
پیڑرو جس کے ساتھ بیٹے خانہ خستگی میں کام آئے جس کا آٹھواں بیٹ
آوارہ گرد ہے امدون بھرونڈیوں کے پیچھے گھومتا رہتا ہے۔

آٹھویں بیٹے کی عمر کیا ہوگی؟ پہلے سپاہی نے پوچھا
یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال۔ بڑھے مالی نے لاش کی طرف
کراپنے جھم پر صلیب کا نشان بتاتے ہوئے کہا: یہ پیڑرو کی لاش ہے
روز بد پہر کو یہاں زیتون کے جھنڈ میں سونے کے لئے آتا ہے۔ اب کبھی
نہیں آئے گا۔ اچھا میں رفکا کو خبر کر دوں۔ وہ افسوس سے سر ہلانے لگا
رفکا کون ہے؟ پہلا سپاہی بولا۔

اس کی بیوی ہے۔

پہلے سپاہی نے معنی خیز نگاہوں سے باقی دو سپاہیوں کی طرف دیکھا
پھر کہنے لگا: نہیں تم مست جاؤ۔ ہم خود خبر کر دیں گے۔ کہاں ہے گھر اس کا؟
بڑھا چپ رہا۔

تیسرے سپاہی نے رافل سیدھی کی بولا: بتاتے ہو کہ ...
بڑھے نے کانپتے کانپتے کہا: وہ سامنے ٹیلے پر اس کا گھر ہے۔

پنٹو ساتھ فالے گاؤں میں اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے گیا تھا۔
اس کی محبوبہ تھی، وہ بہت سی لڑکیوں کو جانتا تھا۔ کیونکہ وہ بے حد خوبصورت تھی
اور ناچنا بہت اچھا تھا۔ اس لئے قرب و جوار کی بہت سی لڑکیاں اسے
چاہتی تھیں۔ مگر پنٹو کو ماریا بہت پسند تھی۔ خود ماریا بھی بہت حسین تھی اور بہت
اچھا ناچتی اور گاتی تھی۔ اس وقت ماریا پنٹو کیسا کے پرانے باغ میں انکھ کی

وں کے درمیان چھپے بیٹھے تھے۔ اور اوڑے اوڑے انگوروں کے گچھے توڑ
 کر کھا رہے تھے وہ ایک تو نا بیکن چمکتی ہوئی ڈال پر بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ
 ل رہے تھے۔ پنڈ کا ہات مار یا کی کمر میں تھا۔ اور مار یا کی آنکھیں خوشی سے
 سار ہی تھیں۔ اور اس کے اچھے ہوئے بھورے بالوں میں شفاف قسم کی
 بسٹ تھی اور اس کی بے داغ زیتونی رنگت میں سونا گھلا ہوا تھا۔ رخسار پر
 ایک ہونٹ کے پاس ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا تل تھا جو مسکراتے
 بہت بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ یکا یک مار یا پنڈ کی طرف دیکھ کے مسکرائی اور پنڈ
 جھپک کر اس تل کو چوم لیا اور انگور کی بیل پچک پچک گئی۔

مار یا نے کہا: بیل درخت سے نکل جائے گی اور ہم لوگ نیچے جا گریں
 ۔۔۔ اور اگر کلیسا کے پاندی نے مجھے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔

۔۔۔ وہ کیوں؟

مجھے بری طرح گھوڑا رہتا ہے۔ گرجے میں۔ گرجے سے باہر کہیں مل
 دے کسی ہسپتال کے ہاں۔ اس کی نظر سب پر وقت مجھ پر گڑی رہتی ہیں۔
 تمہیں چاہتا ہو گا نا۔ کم نجات جان سے جائے گا۔

مار یا نے خوش ہو کر پنڈ کی طرف دیکھا اور انگور کا ایک دانہ اپنے ہونٹوں
 سے دبایا اور پنڈ کی طرف دیکھ کے بولی: ام۔ اس وقت اس کی آنکھیں خوشی سے
 تڑپنے لگیں اور اس کی طرح چمک رہی تھیں اور جب اس نے پنڈ کے ہونٹ
 سے ہونٹوں سے ملتے ہوئے محسوس کئے تو اس کی آنکھیں جھپک کر بند
 ہو گئیں۔ اور وہ انگور کا دانہ اس بوسے کی شیرینی میں گھل گیا۔ اور اس کے رس کو
 اس نے چکھا اور کسی کو یاد نہ رہا کہ یہ انگور کا رس ہے یا ہونٹوں کا رس ہے۔ یادوں
 کا سال ہے ایک شیریں ملائم، لطیف رس تھا جو آہستہ آہستہ روح میں اترا

جارہا تھا۔

پنٹو نے کہا: جب ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم مرغیاں پالیں گے۔ مجھے ننھے ننھے چوزے بہت پسند ہیں۔

ماریا نے کہا: اد میں گھر کے آگن میں زم زم لکڑیاں اگاؤں گی اور میرے سات بچے ہوں گے۔

پنٹو بولا۔ سات تو کم ہوں گے دیکھو ہم آٹھ بھائی تھے۔ اب اکیلا میں باقی رہا۔ کم سے کم گیارہ بچے تو ہونے چاہئیں۔ تاکہ جنگوں میں مرتے مرتے بھی دو تین بچے جائیں۔

ماریا نے مضبوطی سے سر ہلا کے کہا: نہیں سات بچے کافی ہیں، اور ہمیں جنگ سے کیا لینا۔ میں تو اپنے کسی بچے کو جنگ میں نہیں بھیجوں گی۔ جب وہ بھرتی کے لئے آئیں گے ہم لوگ ان نیلیوں کے پچھے جھاڑیوں میں چھپ جائیں گے۔ میں تو بس اپنا چھوٹا سا گھر چاہتی ہوں۔ اللہ اپنے بچے اور ننھیں۔

پنٹو نے کہا: اللہ میرے مرغی کے ننھے ننھے چوزے اور گھر کے پاس ہی وہ کھیت اور یہ نیلا آسمان۔ سچ کہتا ہوں۔ اسپین کا آسمان بڑا خوبصورت ہے۔ کھلا۔ نیلا۔ وسیع۔ میں کہتا ہوں۔ ایسا آسمان تو اور کہاں نہیں ہو گا۔

ماریا نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا: ہاں ہمارے اسپین ایسا خوبصورت آسمان دنیا میں نہیں نہیں ہے۔

وہ دیر تک چپ بیٹھ رہے۔ اور تخیل کے پانی میں اپنے سپنوں کی خوبصورت کشتیاں پیراتے رہے۔ دو خوبصورت کشتیاں جو کبھی ادھر کبھی ادھر تیرتی پھرتی تھیں۔ وہ پیاری پیاری کشتیاں جو ساتھ ساتھ تیر

میری تھیں۔ پانی کے ہلکوروں پر ناچتی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اند پانی چاروں
طرف سے تقریباً تھا۔ اند بیچ میں جہاں کشتیاں تیر رہی تھیں سنہرا تھا۔ اور وہ
افق پر دھند چھائی ہوئی تھی اور پھر کشتیاں ہوئے ہوئے افق کی طرف چل
دیں۔ اور آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی سی ہوتی گئیں۔ پھر نقطے سے رہ گئے اور
پھر وہ دھند میں غائب ہو گئیں۔

ایک ایک ساریا کو جیسے ہوش آگیا۔ گھبرا کر بولی: بہت دیر ہو گئی اب میں
گھر جاتی ہوں۔

پنڈ نے اس کی کمر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ نہیں۔

ماریا مچھلی کی طرح پھسل گئی اور ڈال کے کود کر نیچے جھاڑیوں میں کھڑی
ہو گئی۔ بولی: اچھا تو میں جاتی ہوں۔ کل سبیرا کے تمہاری دعوت ہے
اند ناچ بھی ہے۔ آؤ گے نا۔

پنڈ نے کود کر اسے پکڑ لیا۔ اب وہ مچھلی کی طرح پھسل نہ سکتی تھی۔
اس کے سینہ کے ساتھ لگ گئی۔ ایک آہ بھر کے بولی: کیا چاہتے ہو۔
پنڈ نے آہستہ سے ایک انگوٹھ کا دانہ اس کے ہونٹوں کے بیچ میں
دکھایا۔

گفت
شام کو جب پنڈ، پیڈو کا آٹھواں رکھا ایک خوبصورت رومانی
گفتا ہوا گھر پہنچا۔ تو اس نے اپنے باپ کی لاشیں دیکھی۔ اور اس سے پرے
شر پر اس نے اپنی ماں کو تنگ دیکھا۔ سپاہی اس کے ساتھ زنا کر کے اند کے
ان سے مار کے چلے گئے تھے۔ آٹھ بچوں کی ماں زمین پر تنگی پڑی تھی۔ اور
اس کے دودھ بھرے پستانوں کے بیچ میں ایک گہرا شگاف تھا۔ اور اس
کے ہاتھ میں کاغذ کا پنکھا تھا۔ اور اس کی تنگی پنڈلیوں پر خون منجمد ہو گیا تھا۔

پنٹو نے اپنی ماں کا پٹا پرانا بوسیدہ فراک جو ایک طرف پڑا تھا
 اپنی ماں کے مردہ جسم پر ڈال دیا۔ کوئی اس کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ یہ بڑھا مالی
 تھا۔ بولا: "اے فراک کو کے سپاہیوں نے مار ڈالا۔ مجھ سے تمھارے گھر
 کا پتہ پوچھ رہے تھے۔"

پنٹو نے کچھ نہ کہا۔

بڑھا بولا: "چلو اب ان لاشوں کو ٹھکانے لگا دیں۔ میں گاؤں کے
 آدمیوں کو بلاتا ہوں۔"

پنٹو نے زور سے فرش پر تھوکا۔ پھر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا،
 گاؤں سے باہر چلا گیا۔ بڑھا مالی اُسے آواز میں دیتا رہ گیا۔ لیکن پنٹو نے ایک بار
 پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

x

x

x

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد پنٹو میڈرڈ میں پکڑا گیا۔ تلاشی لینے پر اس کے
 پاس کے ریوالور۔ برین گن اور دوستی گوئے دستیاب ہوئے۔ وہ ان ہتھیاروں
 کو میڈرڈ سے باہرے جا رہا تھا۔ زیر زمین کام کرنے والے کیونسٹوں کے لئے۔
 سارجنٹ مارکاس نے اُسے بہت سے چابک مارے۔ اب بھی وقت
 ہے پرج پرج بتا دے۔

پنٹو کچھ نہیں بولا۔

سارجنٹ مارکاس بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اُس کا رنگ تانبے کی طرح
 تھا اور موٹھیں لارڈ کچنر کی طرح، اس کا امیر باپ اُسے کلیا میں داخل کرنا چاہتا
 تھا کہ کلیا میں داخل ہونا اور کلیا کے لئے کام کرنا اسپن میں سب سے بہتر
 چیز ہے مگر مارکاس پرج میں داخل نہ ہوا۔ اس نے پولس کے ٹھکے کو بہتر مانا۔

دراصل اُسے میٹرڈ کی خواہشوں سے عشق تھا۔ اور یہ عشق وہ گر جا میں رہ کر اتنی مہولت سے نہیں پورا کر سکتا تھا جتنا کہ وہ پولس میں ملازم ہو کے۔ مارکاس ابھی سارجنٹ تھا۔ لیکن اس کے کارناموں سے اب اتنی امید بندھ چلی تھی کہ وہ بہت ترقی کرے گا۔

مارکاس نے ہر طرح کے تشدد سے کام لیا۔ مگر ٹکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مارکاس جلدی میں تھا، شام کو وہ اپنی معشوقہ کے ساتھ کھڑ دیکھنے جا رہا تھا۔ اور یہ بے وقوف لونڈا کسی طرح اقبال جرم ہی نہ کرتا تھا۔ مارکاس نے بار بار گھڑی دیکھی۔ اس نے کہا۔ پندرہ منٹ میں اقبال کر لو۔ ورنہ میں تمہیں ماسکونینج دوں گا۔

پٹو چپ تھا۔

مارکاس نے گھڑی اسٹا کے سامنے رکھ لی۔ اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

سپاہی باہر جا کے قبر کھودنے لگے۔ آج کل اسپین میں کینڈو کو زندہ قبر میں گاڑ دینے کا عام رواج ہے۔ مارکاس بے چارے کو بھی یہی کرنا تھا۔ اور وہ بھی بہت جلدی، کیونکہ اُسے ٹھیک چھ بجے اپنی مجبورہ سے کوئٹس ہوٹل کے فوار میں ملنا تھا۔ وقت بہت کم تھا اور قبر ابھی تک کھدی نہ تھی اس لئے سارجنٹ مارکاس نے غصہ میں اس کے سپاہیوں کو پٹینا شروع کر دیا۔

جلدی زمین کھودو۔ سہمی کی اولاد۔

پٹو کو اس کی قبر میں کھڑا کر دیا گیا۔

اب بھی وقت ہے بولو۔

پنٹو چپ رہا۔

سار جنٹ نے اشارہ کیا۔ سہا ہی اس کے گرد مٹی ڈالنے لگے۔ مٹی
پنٹو کی کمر تک آگئی

”بتاؤ۔ نام بتاؤ۔ ان کیو سٹوں کے جن کے لئے تم یہ اسلحہ جات سے
جار ہے تھے۔ میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ تمہیں پوس میں اچھی سی نوکری دلا دوں گا
گو تم ابھی عمر کے بہت چھوٹے ہو۔“

پنٹو بالکل چپ رہا۔ مٹی اس کے سینہ تک آگئی۔

”لو۔ اس عمر میں مرنے سے کیا فائدہ۔ میں تمہیں مندر کے کنارے
کسی خوبصورت گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر دلا دوں گا۔ ترشے ہوئے پتھروں
کا پکا گھر۔ جس کے آس پاس انجیر کے درخت ہوں گے، اوندانگور کی سیلیں اور
خوشنما گلاب۔ اوندانگور کے آگن میں ایک تھرکتی ہوئی تتلی، مٹھادی بیوی،
... لو۔ یہ سب چھوڑ کے ایک کیونسٹ کتے کی موت کیوں مرنا چاہتے
ہو۔“

پنٹو نے اپنی قبر میں کھڑے کھڑے اوپر دیکھا۔ اس کے سر کے اوپر
انجیر کے درخت کی شاخیں تھیں اوندان سے اوپر آسمان تھا۔ کھلا۔ نیلا۔ وسیع
وہ دیر تک اس آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کسیت، ایک گھر، آگن میں ماریا
کے تھرکے ہوئے قدم۔ مرغی کے چوزے۔ سات نہیں، گیارہ۔ گیارہ نہیں
سات۔ دوسہری کشتیاں ساتھ ساتھ بہتی ہوئیں، وہ پتلے پتلے خمیدہ
ہونٹوں میں دبا ہوا انگور کا اوندان داندہ ... ام ... ام ...

پنٹو دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ آسمان کے رخساروں سے
بہہ نکلے۔ پھر اس نے آہستہ سے گردن جھکا لی۔

”لوہو“ سارجنٹ نے زمی سے کہا

پنٹو نے اُسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا

سارجنٹ مارکاس اس کے قریب جا کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ شاباش، جلدی ہو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ شاباش میں تمہیں مارشل فرانکو سے سونے کا تمہارا بدلہ ملے گا۔ وہ خود نہیں نفیس تم سے مصافحہ کریں گے۔

پنٹو نے زندہ سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

مارکاس نے ٹھوکر میں مارکر پنٹو کا چہرہ ہلکا کر دیا۔ پنٹو کا چہرہ گوشت کا تھا۔ اندام اس کے فوجی بوٹ میں موٹی موٹی سہمی کتلیں تھیں۔
— لوہا اور گوشت —

مارکاس نے گالی بکتے ہوئے کہا: اس کے سر پر مٹی ڈال دو جلدی سے تاکہ یہ فوراً ماسکو پہنچ جائے۔

سپاہی مٹی ڈالنے لگے۔ مٹی پنٹو کی گردن تک آگئی۔

سپاہی اور مٹی ڈالنے لگے۔ یکا یک مارکاس کو ایک نئی ترکیب چھی ہنس کر بولا: شہر و اب کے ایک نیا ڈھنگ ایجاد کرتے ہیں۔ ان حضرات کو زندہ مد گور کرنے کا۔ اچھا اس کا ایک ہاتھ باہر نکالو۔ اندر سے زندہ دفن کر دو، اس گہری زمین میں، صرف اس کے ہاتھ کو قبر سے باہر رہنے دو۔ تاکہ لوگ اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

پنٹو کو زندہ ہی قبر میں دبا دیا گیا۔ صرف اس کا ہاتھ قبر سے اوپر رہا۔ یہ ہاتھ جو بار بار کانپ جاتا تھا۔ یہ ہاتھ جو بیرونی طرح تھا۔ جس سے کھیتی ہوئی زندگی کی حدت اور بڑھتی ہوئی موت کی ٹھنڈک کا اندازہ ہوتا تھا۔ چند لمحوں کے

کے لئے مارکاس نے اسے دیکھا۔ اور پھر وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنی معشوقہ سے ملنے کے لئے چلا گیا جو کہ لباس ہوٹل کے بچے ہوئے فوار میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

شام کے جھٹے میں سینکڑوں آدمیوں نے پولس چوکی کے باہر انجیر کے درخت کے نیچے اس نئی قبر کو دیکھا، جس کے پنج میں سے ایک جوان ہات، ایک تنہا ہوا اکڑا ہوا ہات اکڑا تھا۔ یہ ہات جو ایک خوبصورت پوشے کی طرح قمر کی آغوش سے باہر نکل آیا تھا۔ یہ ہات جو یہ حاتمنا کھڑا تھا ایک ناقابل شکست عزم کی طرح۔ اور اس کی مٹھی زرد سے اندر کو بھنچی ہوئی تھی۔ ایک پکے ہوئے انجیر کی طرح، اور اس ہات کے اوپر انجیر کی ڈالیوں کا سایہ تھا اور بزم بزم توں میں گہرے سرخ انجیر مکرار ہے تھے۔

پھول سرخ ہیں

میں اکثر اسے اپنی مل کے بڑے دروازے کے سامنے چکر لگاتے ہوئے
 دیکھتا تھا۔ اس کی عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گئی۔ وہ بلا پتلا سا نوے رنگ کا لڑکا تھا
 وہ، منہ پر چپک کے داغ تھے۔ وہ ہر روز ہماری مل کے بڑے دروازے کے
 سامنے چکر لگاتا کرتا۔ صبح جب حاضری ہوتی۔ دوپہر کو جب کھانے کے لئے
 چھٹی ہوتی، شام کو جب مل سے نکل کر ہم گھر جاتے۔ میں اسے ہر روز وہاں دیکھتا
 تھا۔ وہ مل میں نوکری کرنے کے لئے نہیں آتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں آنکھوں کے
 اندھا تھا۔ اور ہمارے ملک میں تو ابھی آنکھوں والوں ہی کو روزگار نہیں ملتا
 اندھوں کو کیا ملے گا۔ اندھوں کے لئے ابھی بھیک مانگنا ہی پڑے ہے۔
 مگر یہ اندھا لڑکا ہر شیار تھا اسے میں نے کبھی بھیک مانگتے نہیں

نہیں دیکھا۔ اس کی آواز بڑی ہین، سر ملی اور پیاری تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے دائیں
 ہات میں فلمی گیتوں اور کہانیوں کا بسنڈل لئے ہوئے آتا اور نئے نئے فلمی
 گیت گاتا ہوا ہماری مل کے سامنے چکر لگا کے فلمی گیتوں اور کہانیوں کی کتاب
 ایک ایک آنے میں بیچتا۔ اور ہم میں سے کئی ایک اس اندھے بڑے سے یہ
 کتابیں خرید لیتے تھے۔ مجھے فلم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ سبھی کو ہوتا ہے اول
 تو یہاں مل میں صبح سے شام تک اتنا سخت کام ہوتا ہے کہ کام کرتے
 کرتے سارا جسم دکنے لگتا ہے۔ اور پھر اتنی محنت اور جانکاہی کے بعد جو پیسے ملتے
 ہیں۔ اس میں کسی طرح بھی گھر کا خرچہ ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل سکتا۔ آدمی نہ
 کھا سکے نہ پہن سکے نہ سکے رہ سکے۔ اور دن بھر مجھوری کرتا رہے۔ تو شام
 کو تازہ پینے یا فلم دیکھنے کو جی نہ چاہے گا تو کیا چاہے گا۔ میں تازہ تو کبھی پیتا
 نہیں ہوں۔ ہاں نسلم غرور دیکھتا ہوں جس میں ناچ ہوتے ہیں۔ اور گانے ہوتے
 ہیں۔ اور اچھے اچھے خوب صورت گھر ہوتے ہیں۔ اور عورتیں اور مرد بڑے بڑے
 اچھے لباس پہنے موٹروں میں گھومتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے عشق کرتے
 ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ فلموں میں ہر شخص ہر وقت عشق کرتا رہتا ہے۔ جسے دیکھ
 محبت کر رہا ہے یا کرنے جا رہا ہے۔ یا کہ مرنے جا رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ لوگ
 کام کس وقت کرتے ہیں۔ مل میں کبھی جاتے ہیں کہ نہیں۔ اتنا ہنسنا کھڑا ہونے
 پر اتنے اچھے لباس کہاں سے پہن لیتے ہیں، ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے
 آتا ہے کہ اس شان سے رہ سکیں۔ ہملوگ تو سات جنم بھی محنت کرتے ہیں تو
 اتنا پیسہ نہ ملے۔ اور پھر ایک اور عجیب بات میں نے یہ فلموں میں دیکھی کہ جو امیر
 ہے۔ وہ غریب سے محبت کر رہا ہے۔ جو مل مالک کا بیٹا ہے۔ وہ مزدور کی لڑکی
 سے محبت کر رہا ہے۔ جو مزدور کا بیٹا ہے وہ مل مالک کی لڑکی سے عشق کر رہا ہے

اور ڈکی ہے کہ سر جھٹکنے عاشق کے قدموں میں گر رہی ہے۔ اور آخر میں مل ملک
 خود سر یا یہ پستی چھوڑ کر مزدوروں کا بھلا چاہنے لگتے ہیں۔ بھئی ایسے بل ملک
 اور ان کی رڑکیوں کا پتہ کسی کو ہو، تو ہمیں بتائیے۔ ہم تو یہی ترستے رہ گئے کہ مل
 ملک تو کہاں اس کا فورین ہی ہم سے یہی طرح بات کرے۔ مگر صاحب
 پھر بھی فلم میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ اور وہ بھی چار سونے میں۔ مگر سنیا بھی تو روز
 روز نہیں دیکھا جاسکتا۔ کئی دفعہ تو نئے نئے فلم آتے ہیں۔ اللہ آکر چلے جاتے ہیں
 اور ہم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ چونی بھی پاس نہیں ہوتی۔ اس موقع پر ہم اس انداز
 رٹکے سے کتاب خرید لیتے تھے۔ فلم کی کہانی پڑھتے ہیں۔ گیت اس سے سنتے
 ہیں۔ اور سن کر خود گنگنا رہتے ہیں۔ ایک آنے میں نشہ پانی ہو جاتا ہے۔ اپنی
 زندگی میں اس قدر دیرانی ہے کہ کہیں سے بھی روشنی کی کرن ناچتی ہوئی نظر
 آجائے۔ ہم اُسے دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ اور سوچتے رہ جاتے ہیں۔ بھیا بھیا
 یہ کرن کبھی ہمیں بھی مل سکتی ہے۔ یہ سیدنا پارح کبھی ایسے آنگن میں بھی جاگ
 سکتا ہے۔ یہ ہراتی ہوئی دھن کبھی اپنی زندگی کا گیت بن سکتی ہے۔ کام کرتے
 کرتے ہم ہی سوچنے لگتے ہیں۔ اور دوسروں کے لئے خوبصورت کپڑے بننے
 بننے اپنے لئے بھی خوبصورت پننے بننے لگتے ہیں۔ پھر فورین ہمیں اس کے گالی
 دیتا ہے۔ اور ہمارے پننے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور خوبصورت کپڑا گانٹھوں میں
 بند ہو کے چلا جاتا ہے۔ اور ہمارے ہم اور ہمارے خواب ننگے کے ننگے رہ
 جاتے ہیں۔

انہی باتوں سے تنگ اس کے ہم نے ایک دن مل میں ہڑتال کر دی۔
 لال جھنڈے ڈوائے آئے تھے۔ اور انہوں نے ہڑتال کرائی تھی۔ لال جھنڈے
 وائے پہلے بھی آتے رہتے تھے۔ مگر میں کبھی ان کی یونین میں شریک نہیں ہوا

تھا۔ میں دن بھر کام کرتا۔ شام کو کبھی کبھار فلم دیکھتا۔ اور فلمی گیت گنگنا تا
 پھر گھر چلا جاتا۔ اور سوکھی روٹی کھا کے اندھا شد کا شکر کر کے سو جاتا۔ مگر جب اناج
 ہنگا ہو گیا۔ اور کپڑے کا بھاؤ چوگنا ہو گیا۔ اور کوئلہ جو روز کے جلنے کی چیز تھی
 ایک مارکیٹ کے بھائے سے ملنے لگا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے جو تنخواہ ملتی
 ہے۔ وہ گھٹ کے ایک چوتھائی رہ گئی ہے۔ مگر تنخواہ تو یہی تھی، اتنے ہی پیسے
 تھے۔ مگر اب پورے نہ ہوتے تھے۔ نہ روٹی پیٹ بھر کے ملتی، نہ بچوں کے کپڑے
 اب تو کھولی کا کر ایہ انا کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اب میں نے سینما دیکھنا بھی بند
 کر دیا۔ اس سے پہلے میں بھی فلم کے گیت سن سن کر اُسی طرح گیت گھڑیا کرتا
 تھا۔ اور سیٹی میں گانے کے خوش رہا تھا۔ اب ہونٹوں پر پٹریاں جھنے لگیں اور گیت
 نہ گنگنا جاتے تھے، نہ گھڑے جاتے تھے۔ کبھی کبھی سوچتا کہ وہ فلمی کارخانے
 والے کی لڑکیا جو مزدور سے عشق کرتی تھی، اس وقت کہیں سے مل جائے تو
 مزا آجائے۔ مگر یہ باتیں زندگی میں کہاں۔ مل مالک کی لڑکی ایک نیلے رنگ
 کی آسمانی موٹر میں بیٹھ کر کبھی کبھی مل میں آتی تھی۔ اور سیٹھ سے مل کر ہمارے
 پاس سے گزر جاتی تھی۔ وہ موٹر میں آتی تھی اور موٹر میں جاتی تھی۔ اور کبھی اس نے
 ہماری طرف نہیں دیکھا کہ ہم اتنا بھی کہہ سکتے۔ مل کے پھر گئیں انکھیاں۔

تو جب کوئی بہا مانہ رہا۔ اور لال جھنڈے تلے کھڑے ہو کے مزدوروں
 نے ہڑتال کرنے کی قسم کھائی۔ تو میں بھی پہلی بار ان کے ساتھ شامل ہو گیا
 ہڑتال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جو آدمی دن رات محنت کرنے کا عادی
 ہو اس کے لئے چار دن بیٹھا رہنا بھی کھل جاتا ہے۔ اپنی مشین کی ہتھکیاں اور چرخیاں
 بار بار آنکھوں کے سامنے گھومتی ہیں۔ پھر روزی کا آسرا بھی نہیں ہوتا۔ اپنا
 ہی پیٹ کاٹ کے ہڑتال کرنی پڑتی ہے کوئی بینک میں روپیہ تو ہوتا نہیں، کہ

آدمی روپیہ نکلوتا چلا جائے اور گھر میں آرام سے بیٹھ کے کھاتا جائے جسے ہمارے
مل مالک کر سکتے ہیں۔ سبھی کہتے ہیں کہ مزدور ہسپتال نہ کرے۔ کام زیادہ کرے، اور
محنت زیادہ کرے، اور کپڑا زیادہ بنے ہمیں یہ سب منظور ہے۔ ہم کام بھی زیادہ
کرتے ہیں۔ کپڑا بھی زیادہ بنتے ہیں۔ اور جوں جوں ہم کپڑا زیادہ بنتے ہیں۔ بازار میں
کپڑے کا بھاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ مل مالک کا پیٹ پھولتا جاتا ہے۔ اور ہماری
روزی کم ہوتی جاتی ہے۔ بھیا میرے کسی سے کہو اور حرجی تو دھیان دے۔ پہلے
ہم چوٹی کا سینا دیکھتے تھے۔ اب وہ بھی نہ رہا۔ تو کیا کریں۔

خیر جی جب ہسپتال ہوئی اور بڑی دھوم دھڑکے سے ہوئی۔ اور کوئی
مزدور مل میں نہیں گیا۔ سوائے آٹھ دس شخصوں کے۔ تو ہم لوگوں نے بڑی خوشی
منائی۔ پولس کا پہرہ لگ گیا۔ مگر ہم لوگ اس کے باہر ٹولیوں میں کھڑے اطمینان
سے باتیں کرتے رہے۔ اس روز بھی اندھا لڑکا مل کے سامنے گھوم گھوم کر گاتا رہا
مگر آج کسی نے اس سے ایک کتاب بھی نہ لی۔ اس نے اپنی ہین اسٹیجی اندھیری
آواز کا سارا زور لگا دیا۔ مگر کسی مزدور نے ایک آنہ بھی اپنی جیب سے نہ نکالا، کیونکہ
بھیا اب ہم لوگ ہسپتال پر تھے، اور جانے یہ ہسپتال کے مزدور ہے۔ اور ایک آنہ
ایک آنہ ہوتا ہے۔ صبح و شام کے چنے چل سکتے ہیں۔ مجھے ہنسی آتی ہے،
کبھی کبھی یہ من کر جب لوگ کہتے ہیں کہ مزدوریوں ہی لوگوں کے سکھائے پڑھائے
جوش میں آکر ہسپتال کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ مزدور مرغ اور پلاؤ کھا کر
ہسپتال نہیں کرتے۔ وہ چنے کھا کر اور مٹھیاں بھینچ کر اور اپنے دل کا بہوشک
کر کے ہسپتال کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو فاقے سے مبرا ہوا دیکھتے ہیں۔ اپنی
بیویوں کو پانی میں گھاس اباتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ننھی لگا ہیں کر کے اور دانت
پیس کر مل کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اندر نہیں جاتے۔ کوئی

کمزد طاقت، کئی سو طرح کے لالچ اور فریب انہیں جھکیں جھکیں کر اندر
بھیجنا چاہتے ہیں، پھر بھی وہ اندر نہیں جاتے۔ میں تم سے پچھتا ہوں۔ گولی
کھانا آسان ہے۔ ہسپتال کرنا آسان نہیں ہے۔

ہاں تو جب ہسپتال کے پہلے روز اندھا دکھائی دے گا تو گاتے گاتے تعک
گیا۔ تو سامنے کے پل کے پاس خط ڈالنے والے بے کا ہمارا لے کر کھڑا ہو گیا۔
میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ بالکل رونا کھاسا ہو رہا ہے۔ ہماری طرح وہ بھی کم پریشان
نہیں تھا۔ شاید صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اس کے
پاس چلا گیا۔

میں نے پوچھا: آج کتنی کتابیں کہیں؟
"ایک بھی نہیں۔"

میں نے کہا: "اب یہاں نہیں کہیں گی۔"
"کیوں۔"

"یہاں ہسپتال ہو گئی ہے۔"

"ہسپتال کیا ہوتی ہے۔"

"مزدور کام پر نہیں جاتے۔"

"کیوں نہیں جاتے۔ کیا وہ بیمار ہیں؟"

"بیمار نہیں ہیں۔ لیکن ایک طرح سے بیمار ہی سمجھو۔ اگر گھر میں چین نہ

ہوگا، جسم پر کپڑا نہ ہوگا۔ پیٹ میں روٹی نہ ہوگی۔ تو آدمی کام کیسے کر سکے گا؟"

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا: "آج ایک کتاب

بھی نہیں کہی۔"

آج ہسپتال ہے۔ میں نے کہا۔

انداس روز بھی ایک کتاب نہیں بکی تھی جس روز کہتے ہیں آزادی آئی
 فی پسندہ اگت۔ سب لوگ خوشی سے نہچ رہے تھے۔
 تم کیوں نہیں ناچے؟
 میں بھوکا تھا۔

میں چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جیب کا ایک آنہ نکال کے
 دیا۔ اس نے نہیں لیا۔ بولا۔
 ... میں اندھا ہوں۔ مگر میں بھکاری نہیں ہوں۔ میرا باپ بھی اسی بل میں
 رہتا۔ وہ اکسی ڈنٹ میں مارا گیا تھا۔
 کیا ہوا تھا؟

فورمین کی غلطی سے مشین میں کچلا گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ غلطی
 اس کی اپنی تھی۔

میں نے کہا: تم یہ ایک آنہ لے لو۔
 وہ بولا: نہیں میں بھیک نہیں مانگوں گا۔ اس کے لب سختی سے
 دھکے کھینچ گئے۔

میں اس کے پاس سے چلا آیا۔
 ہسپتال کے دو سرورڈ تیسرے روز چوتھے روز میں اسے برابر کتے دیکھتا
 تھا۔ وہ بات میں کتابیں لئے گاتا رہا۔ کسی نے اس سے کتاب نہیں لی۔ وہ گاکے
 بے تحاشہ کیا۔ تو ڈاکوٹا کے بے کے پاس ہمارے کرکھڑا ہو گیا۔
 میں نے اس سے کہا: آجکل یہاں ہسپتال ہے۔ کس کو فلم کے گانوں میں
 جی ہو گی۔ تم کہیں ادر جاؤ۔
 وہ بولا: کہاں جاؤں۔ مجھے راستے نہیں آتے۔

میں نے کہا: فورٹ جاؤ، وہ ٹریفیوں اور مالداروں کی بستی ہے
وہاں تمہاری کتابیں بہت فروخت ہوں گی۔ آؤ میں تمہیں خود وہاں
پہنچاتا ہوں۔

میں اُسے فورٹ میں پہنچا آیا۔

لیکن دو گھر روزہ پھر واپس چلا آیا۔ مل کے سامنے بولا۔
"وہ لوگ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ دیسی فلموں کے گانے ریڈیو پر
سن لیتے ہیں۔ وہ لوگ میری کتاب نہیں لیتے۔"

اتنے میں لال جھنڈے ڈالے آ گئے۔ ان کے ساتھ دوسری فلموں کے
مزدور بھی تھے۔ ہم سب لوگ مل کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر نعرے
لگاتے رہے۔ اور پھر انقلابی گیت گانے لگے۔ گاتے گاتے میں نے
دیکھا کہ وہ اندھا رٹکا بھی ڈاکو نے کے بیسے چل کے ہمارے مجمع میں آ گیا
ہے۔ اور آہستہ آہستہ ہمارا گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ گاتے
گاتے جب اس کی دھن اُسے اچھی طرح یاد ہو گئی۔ تو وہ سب سے ادب بجا گاتے
لگا۔ اور ہم سب اس کے پیچھے دہرانے لگے۔ اس کی آواز بڑی ہین، میٹھی اور
سرٹلی تھی۔ بڑا لطف رہا۔ جب گیت ختم ہو گیا۔ تو ہم سب نے اُسے شاباش
دی۔ مزدوروں نے اُسے کس دے پر اٹھایا۔ اور لال جھنڈا اس کے ہاتھ
میں تھما دیا۔ اور بولے۔

"یہ چاچا فضل کو بیٹا ہے۔ فضل ارجمان اسی بل میں کام کرتا تھا۔"

چاچا فضل کو بیٹا ہے۔

میں نے دیکھا اندھے کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔
جب سب چلے گئے۔ تو اس نے کانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

یہ گیت مجھے بہت پسند آیا۔

میں نے کہا: یہ ہمارا سرخ گیت ہے۔

وہ بولا: انہوں نے مسکرات میں جھنڈا دے دیا۔ میں تو بہت چھو

ہوں۔

میں نے کہا: تم شہید کے بیٹے ہو۔ چاچا فضل الرحمن کے۔

وہ بولا: اس جھنڈے کا رنگ کیسا ہے؟

سرخ۔

سرخ رنگ کیا ہوتا ہے؟

میں نے کہا: تم کیا سمجھو گے۔ تم نے کبھی سرخ رنگ دیکھا ہی نہیں۔

جیسے آدمی کا لہو ہوتا ہے۔ یہ ہمارے مزدوروں کی محنت کا رنگ ہے۔

وہ دیر تک جھنڈے پر بات پھیرتا رہا۔ بولا۔

اب میں اس رنگ کو نہیں جھولوں گا۔

کیسے؟

وہ ہنسا۔ یہ نہیں بتاؤں گا۔ پھر ایک وقفے کے بعد کہنے لگا: وہ

گیت بہت اچھا تھا۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ اب یہ دوسرے گیت گانے کو۔ کوئی

دوسرا گیت تمہارے پاس ہے ایسا ہی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر اس کے آہستہ سے کہا: کسی سے کہنا

نہیں۔ میں بھی گیت لکھتا ہوں۔ مگر وہ بڑے میسے ہوتے ہیں۔ میں کسی کو دکھاتا

نہیں ہوں۔

وہ بولا: تم گیت لکھو۔ میں گانوں گا۔ بس ایسے ہی لال لال گیت لکھنا۔

رات کو میں نے ایک بھداسا، بھداسا، چٹا چٹا نا، ہمارا گیت لکھا۔

بڑی شکل سے لکھا۔ مگر دل سے لکھا۔ اس گیت میں میں نے اپنے دل کا سارا
 اپنی بیوی کی ساری مصیبت اپنے بچے کی ساری کی ساری بھوک ڈال دی۔ اور
 میں یہ تنگ پایا سا بھوکا گیت بے کے اپنے اندھے دوست کے پاس گیا۔ اندھ
 نے اپنی اندھی روح کی ساری بینائی اور اپنی تاریک دنیا کی ساری گھٹری
 اور اپنے اندھیارے کا سارا نور اس میں ڈال دیا۔ اور گیت ایک تلوار بن گیا۔ اور
 جب اندھے رٹکے نے اُسے گایا۔ تو جمع جیسے سوتے سے جاگ گیا۔ اور ہزاروں
 تلواریں جیسے برہنہ ہو کے مل کے دروازے پر نچ کر گئیں۔ اور محافظوں کے
 چہرے فرق ہوتے گئے۔ اور ہم لوگ بڑھتے بڑھتے بالکل بل کے دروازے پر
 آ گئے۔ اور میجر نے فوج کے بلانے کے لئے ٹیلیفون کیا۔

خیر ہم لوگ واپس چلے گئے۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ ہمارا اندوختہ ختم ہو رہا تھا۔ امیدیں ٹوٹی جا رہی
 تھیں۔ اور بہت سے مزدور واپس کام پر جانے کی سوچ رہے تھے۔ کیونکہ مل ہم
 اُسی طرح اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اور جو لوگ نچ میں سمجھوتہ کرانے آئے تھے وہ ہم
 ہمیں ڈانٹتے تھے۔ اور اخبار بھی بڑے آدمیوں کے تھے وہ بھی ہمیں ڈانٹتے تھے
 اور کوئی ہماری مدد نہیں کرتا تھا۔ نصیحت سب کرتے تھے۔ اسی پریشانی میں دن
 گزرتے جا رہے تھے۔ اور کوئی فیصلہ نہ ہو رہا تھا۔ آج بہت سے مزدوروں
 نے طے کر لیا کہ وہ کل سے کام پر چلے جائیں گے۔ ہمارے بھانے کے باوجود
 بھی وہ لوگ نہیں مانے۔

میں بہت اُداس تھا۔ میرا اندھا دوست بھی بے مدد بخود تھا۔ ہم
 لوگ آہستہ آہستہ مل سے چلے۔ وہ بولا۔
 کل سے مزدور کام پر جائیں گے۔

ہاں " میں نے بے دلی سے کہا
 " تم بھی جاؤ گے ؟ " اس نے پوچھا
 " نہیں "

" تو پھر کیا کرو گے ؟ "

میں چپ ہو رہا

وہ بولا : " انہوں نے سرخ جھنڈا سیکڑا کر ہاتھ میں دیا تھا "

میں پھر چپ رہا ۔

وہ بولا : کل کے لئے کوئی گیت لکھو گے ۔ کوئی بہت اچھا سا گیت "
 میں پھر بھی چپ رہا ۔

مجم پھولوں کی ایک دوکان کے سامنے سے گزر رہے تھے ۔ وہ چپ
 چاپ کھڑی ہو گیا ۔ دیر تک کھڑا رہا ۔ بولا ۔

" یہ پھول مجھے بہت پسند ہیں ۔ ان کی خوشبو کتنی بھینی بھینی اور پیاری
 ہوتی ہے ۔ جی چاہتا ہے ۔ کوئی مجھے بہت سارے پھول دے دے ۔ ڈھیریوں
 کے ڈھیر "

میں نے کہا : " میری جیب میں دو پیسے ہیں "

وہ بولا : " آگے چلو ، چسے کھائیں گے "

دوسرے روز ہم دونوں بہت صبح ہی مل کے بندواڑے پر پہنچ گئے ۔ اس
 کے ہاتھ میں جھنڈا تھا ۔ اور لبوں پر میرا نیا گیت ۔ اس سے اچھا گیت میں نے
 آج تک نہیں لکھا تھا ۔ اس سے اچھا گیت اس نے آج تک نہیں لکھا تھا ۔

جیسے یہ گیت ہم دونوں کی آخری کوشش تھا، جیسے ظلمت چاروں طرف پھیل جائے اور نور کی آخری کرن بجھنے سے انکار کر دے۔ جیسے شب و روز کی محنت نفع کا دریا بن جائے اور کوئی اسے عبور نہ کر سکے۔ جیسے روز و روز کے فلسفے اینٹیں چن چن کر مل کے دروازے پر دیوار کھڑی کر دیں۔ اور اندر جانے والوں کا راستہ روک دیں۔ کوئی اندر نہیں گیا۔ جو آگیت کے سمندر میں شامل ہوتا گیا۔ بل کے دروازے کھلے تھے۔ لیکن کوئی اندر نہیں گیا۔ پھر کام بگڑتا دیکھ کر مل مالک کے پٹھوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ اور ہم نے حملے کا جواب دیا۔ اور گولی چلی۔ اور ایک بھگدڑی مچ گئی۔ اور میں نے اندھے رٹ کے کو گرتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے ہاتھ سے ایک دوسرے مزدور کو جھنڈا اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اور میں نے بھاگ کر اندھے رٹ کے کو اپنی باہوں میں اٹھالیا۔ اور اسے بھریے کڑکال کے باہر لے آیا۔ اور ہسپتال کی طرف دوڑنے لگا۔

ہسپتال میں اس کی چارپائی کے گرد بہت سے مزدور جمع تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ ایک آدھ گھنٹے کا ہمان ہے۔
 وہ بولا: مل کے اندر تو کوئی نہیں گیا؟

میں نے کہا: نہیں۔

کوئی نہیں۔

ایک بھی نہیں۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آہستہ سے کہنے لگا۔

انہوں نے جھنڈا میسرے ہات میں دیا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زس اس کا سر تھپکنے لگی۔ اندھے رٹ کے

کے نتھنے ہلنے لگے۔ بولا۔

کتنی اچھی خوشبو آرہی ہے، کس کے پاس پھول ہیں؟
 نرم نے خوشبو لگا رکھی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے
 روک دیا۔ اللہ ایک ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔
 کس کے پاس پھول ہیں؟ اس نے پھر پوچھا۔
 میں نے کہا: پھول باہر دکان پر ہیں۔ میں نے منگوائے ہیں تمہارے
 لئے۔

وہ چپ ہو رہا۔ ساتھی نے چنبیلی کے پھولوں کا ایک بڑا گچھا لاکے
 میسرے ہاتھوں میں دیا۔ میں نے اپنے اندھے دوست کے کانپتے ہوئے ہاتھوں
 میں تھما دیا۔

چنبیلی کے چمکتے ہوئے سپید سپید پھول اس کے کمرہ سانولے
 ہاتھوں میں تھے۔

وہ بولا: کتنے اچھے پھول ہیں یہ۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو، ان کی
 رنگت؟ وہ چنبیلی کی نرم و نازک سپید پتیوں پر ہات پھیرنے لگا۔ یکا یک
 اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ بولا۔

• سرخ پھول ہیں نایہ۔ سرخ — سرخ •

نرم کچھ کہنا چاہتی تھی، میں نے اُسے روک دیا۔ اللہ زندھے ہوئے
 گھلے بولا۔

• ہاں چھوٹے سجیا۔ ان کا رنگ بالکل سرخ ہے۔ بالکل سرخ ہے۔
 اس نے پھر پوچھا: اتنا سرخ جتنا ہمارا جھنڈا۔ جتنا آدمی کے دل کا

نہو؟

• ہاں میں نے مشکل سے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا: ہاں چھوٹے

بھتی یہ پھول بالکل سرخ ہیں۔

”بڑے اچھے پھول ہیں یہ۔ وہ خوشی کا سانس لے لے کے رک رک کے
 بولا۔ بڑے اچھے پھول ہیں یہ۔ یہ سرخ سرخ پھول ... میرا جی چاہتا ہے
 میں ان سرخ سرخ پھولوں میں چھپ جاؤں۔“
 پھول اس نے اپنے رخسار سے لگائے۔ اب اس نے نکھیں بند کر لیں۔ ہمیشہ
 کے لئے۔

وارڈ میں کسی نے سسکی لی۔ کسی کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلکا۔ کوئی
 منہ چھپکے رونے لگا۔

وہ آج ہم میں نہیں ہے۔ میں آج اس کی قبر سے ہو کے آیا ہوں۔ میں
 کی قبر کھدی ہے۔ اللہ ویران ہے۔ اور اس پر کوئی پھول نہیں ہے۔ اور آج جب
 میں اس کی قبر دیکھنے گیا تھا۔ تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”بھتی! یہ سرخ سرخ پھول میری قبر پر کب کھلیں گے؟“

اور میں نے کہا: چھوٹے بھتی! میں آج ایک جگہ متھاری کہانی سننے
 جا رہا ہوں۔ اُن سے یہ سوال ضرور پوچھوں گا۔

بت جگتے ہیں

یہ کہانی جو میں آج آپ کو سنارہا ہوں کل تک نہ ہوئی تھی۔ کل رات کے دو بجے تک اس کہانی کے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کل رات کے دو بجے تک جب میں سوچتا سوچتا تھکا گیا، اور یہ کہانی نہ آئی تو میں اس کی تلاش میں گھومتا گھومتا چوپائی کی طرف نکل گیا۔ یہاں اس وقت اک عجب سا ٹامرا سا مٹا ہمنہ کا سونہ بہت دھیمہ تھا۔ اور وہ کہیں دور افق کے سینے سے گاک کر مدھم مدھم سروں میں بلک بلک کر رہا تھا۔ اور کنارے کچھ ریت بھی لاکھوں انجانے قدموں کے گھاؤ اپنے سینے میں لئے آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ ساری فضا پر ایک عجیب کر بناک تھکن کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اور میں اس

عجیب سی فضا کے اذیت ناک تاثر کو قبول کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یکایک میرے کانوں میں آواز آئی: "تمک بھگوان"

میں نے گھبرا کر دیکھا۔ سامنے تمک ہمارا ج کا بت تھا۔ جو اک عجیب شان و نمکنت سے سر پر غور اٹھائے فضا میں تک رہا تھا۔ اُن کے قدموں میں میں نے اک پرچھائیں سی دیکھی، اُس کا چہرہ تو میں صاف صاف نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ اس کی پشت میری طرف تھی، ہاں اتنا ضرور دیکھا کہ وہ اک ادھبی رنگ کا ناٹے قد کا گندمی رنگ کا سراٹھا ہے۔ اس کی قمیص اور دھوتی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے پاؤں تنگے تھے۔ اور ٹانگوں پر گہرے زخموں کے نشان تھے۔ اسے دیکھ کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ اور میں اس کی باتیں سننے کے لئے وہیں ریت پر لیٹ گیا۔ تاکہ وہ یہی سمجھے کہ یہ شخص ریت پر سوجھا ہے۔ میری باتیں نہیں سن رہا ہے۔

اُس آدمی نے پھر کہا: "تمک بھگوان!"

تمک بھگوان کے بت نے کہا: "کہو کیا کہتے ہو"

آپ کو شاید چنبھا ہو گا کہ کہیں تپھر کا بت بھی بول سکتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہراما دس کو جب چاروں طرف گھورا اندھیرا ہوتا ہے، اندر آدمی رات کا وقت ہوتا ہے، اُس وقت بت جاگتے ہیں۔ اور جاگتے ہی نہیں باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں بلائے اور ان سے کچھ پوچھے تو اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بات شاید معلوم نہیں مجھے ایک عرصے سے معلوم تھی۔ مگر میں نے کبھی بات نہیں کی۔ اول تو دنیا کے کاموں سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ آدمی رات کے دو بجے ان سے بات کرنے جائے۔ پھر مبینی میں جتنے بت ہیں اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ہیں کہ آدمی

سوچتا ہے کہ ان قابل ہستیاں ہستیوں سے آدمی بات کس طرح سے کرے۔ نہ معلوم کون سی بات نہ ناگوار خاطر ہو۔ پھر آزادی سے پہلے تو یہ بھی اندیشہ تھا کہ خفیہ پولیس کہیں اس جرم میں نہ گرفتار کرے کہ یہ آدمی بال گنگا دھرتی ملک کے بت سے بات کر رہا تھا۔ اور نہ جانے بھٹانوی حکومت کے خلاف کیا کیا سازشیں عمل میں لارہا تھا۔ اور آج کل یہ ذرا رہتا ہے کہ پولیس اس لئے نہ پکڑے کہ دیکھے یہ آدمی اپنی ہی حکومت کے خلاف اپنے ملک کے لیڈر بال گنگا دھرتی ملک سے شکایت کر رہا تھا۔ انہی باتوں کو سوچ کے ہم نے آج تک کسی بڑے لیڈر کے بت سے کبھی بات نہیں کی۔ گو اس دوران میں کئی اندھیری راتیں آئیں، اور چلی گئیں۔ لیکن ہم بالکل خاموش رہے آج اپنی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی شیر مرد کو ملک بھگوان کے بت سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ میں ریت پر لیٹا لیٹا آگے گھسنے لگا۔ تاکہ اچھی طرح اداطینان سے ان کی باتیں سن سکوں۔

مرہٹہ کہہ رہا تھا: میرا نام اٹھ راؤ کھانڈیکر ہے۔ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا۔

ملک ہمارا ج بونے: میں بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا تھا۔
کھانڈیکر بولا: میں پوتا کے ایک اسکول میں استاد تھا۔ مجھے اتہاس سے بڑی دلچسپی تھی۔

ملک ہمارا ج بونے: مجھے بھی تاریخ سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔

کھانڈیکر بولا: جن دنوں آپ نے وہ نعرہ بلند کیا کہ آزادی میرا پیدائشی حق ہے میں ان دنوں میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھیں آپ کی بہت سی تقریریں سنیں۔ میں بچوں کو اتہاس پڑھاتا تھا۔ اتہاس پڑھاتے

پڑھاتے میرے دل میں نئی نئی انگلیں پیدا ہونے لگیں عجیب عجیب سے
خیال میرے دل و دماغ پر چلنے لگے۔ میں نے بچوں کو تاریخ اک بالکل
نئے ڈھنگ سے پڑھانا شروع کر دیا۔ اور جب میں پڑھاتے پڑھاتے غدر
پر آیا۔ تو

”تو کیا ہوا؟“ ملک بھگوان نے پوچھا۔
”تو مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔“

افسروں نے کہا کہ غدر غدر تھا۔ آزادی کی تحریک نہ تھی۔ میں جھوٹا تھا اور سازشی
تھا۔ اور بچوں کا اخلاق خراب کر رہا تھا۔ اور ملک معظّم کی حکومت کے خلاف نفرت
پھیلاتا تھا۔ اس لئے مجھے اسکول سے باہر نکال دیا گیا۔ اور مجھ پر ردّی کے سائے
دروازے بند کر دیئے گئے۔“

پھر تم نے کیا کیا ”ملک بھگوان نے پوچھا۔

”پھر میں نے ریزگار کے لئے ہروہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں سے دشمن جگمگتی کے
طفیل مجھے روٹی ملنے کی آس تھی۔ کہیں پر بھی کچھ نہ ہو سکا۔ اس میں کسی کا قصور نہ
تھا۔ حکومت کا رعب اس قدر غالب تھا کہ کوئی میری مدد کے لئے تیار نہ ہوتا تھا
پھر میں ملکی تحریک میں زور و شور سے حصہ لینے لگا۔ اور میری بیوی نے لڑکیوں
کے اسکول میں ملازمت کر لی۔ لیکن جب مجھے پہلی بار قید ہوئی۔ تو اس کی
وہ نوکری بھی چھٹ گئی۔ ہمارے دو بچے تھے۔ وہ فاقوں کی نذر ہو گئے۔ میری
بیوی اپنے میکہ چلی گئی۔ جہاں گاؤں کے پٹیل نے اُسے اپنے ماں باپ کے
گھر سے یہ کہہ کے نکلوا دیا کہ اُسے گھر میں رکھو گے تو تم پر بھی آپریشن آئے گی۔ میری بیوی
جب گھر سے نکالی گئی تو اس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ زندگی بن کر گزارہ
کر سکتی تھی۔ مگر اس کی روح نے یہ گواہی دے دیا۔ اور وہ مذی میں ڈوب کر مر گئی۔ جب

میں جیل سے رہا ہوا تو میں بالکل آزاد تھا۔ اب مجھ پر گھربار کا کوئی بوجھ نہ تھا۔
میں نے بڑی مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا گاؤں میں۔ اور جب یہ تحریک
چلی کہ لگان نہ دیا جائے۔ اس وقت میں چند دن واڑی کے گاؤں میں ہی تھریک
چلا رہا تھا۔ پہلے افسروں نے پھر پولس نے پھر فوج نے ہم سے لگان وصول
کرنا چاہا۔ لیکن میں نے گاؤں والوں سے لگان نہ وصول کرنے دیا، اور اس لئے
مجھے گولی مار دی گئی اور میں مر گیا۔ یہ نشان دیکھئے میرے جسم پر کم از کم بیس
گولیوں کے نشان ہیں۔

میں بہت افسوس ہے۔ "تک ہمارا ج بولے" کیا نام بتایا تم نے؟
"اتم ماؤ کھاٹڈیکر"
کبھی سنا نہیں یہ نام۔

کھاٹڈیکر بولا: "میرا نام کوئی نہیں جانتا۔ میری بیوی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا جو
ندی میں ڈوب مری تھی۔ مسیکران دوپچوں کے نام بھی کوئی نہیں جانتا جو
فاقے کرتے کرتے مر گئے۔ تارتخ میں ہمارا کہیں نام نہیں ہے۔ پتیا بھی ستیا یا
نے کا نگرس کی جو تارتخ لکھی ہے اس میں بھی ہمارا کہیں نام نہیں ہے۔ اب ہمارا
نام کہیں نہیں ہے۔ پونا دالے۔ گاؤں والے سارا ہمارا شٹر مجھے بھول
چکا ہے۔"

"تو اب تمہیں کیا پریشانی ہے؟" "تک ہمارا ج نے پوچھا۔
پریشانی نہیں ایک خواہش ہے۔ اسے پورا کرانے کے لئے آپ کے پاس
آیا ہوں۔"

"تک ہمارا ج بولے: میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو پتھر کا بت ہوں۔"
کھاٹڈیکر بولا: بس میں بھی یہی بننا چاہتا ہوں۔ ایک پتھر کا بت، اپنے مرنے کے

بعد آج تک حیران و پریشان ہو کر یہاں کی فضا میں گھومتا رہا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ کی طرح ایک پتھر کا بت بن جاؤں۔ خدا نقوڑی سی جگہ سے دیکھے۔

اور میں نے دیکھا کہ وہ پرچھا میں چپہ تھے پر چڑھنے لگی۔
 "تمک ہمارا ج گھبرا کر بولے "کیا کر رہے ہو؟"

کھانڈیکر نے کہا: میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے نقوڑی سی جگہ چاہیے آرام کے لئے۔ میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ میں نے زندگی بھر آپ کے پہلو پہ پہلو کام کیا ہے۔ کیا موت کے بعد روح کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے؟

تمک ہمارا ج نے کہا: نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے۔ مگر اصل یہ جگہ میری ہے۔ یہ چوترا میرا ہے۔ یہ بت میرا ہے۔

کھانڈیکر بولا: تو میری جگہ کہاں ہے۔ تاریخ میں نہیں۔ چرپائی کے کنارے نہیں لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ تو میں کہاں جاؤں؟

تمک ہمارا ج بولے: میونسپل کارپوریشن کے پاس جاؤ۔ وہ لوگ متاعے لئے ایک بت بنادیں گے۔

کھانڈیکر بولا: مگر وہ تو آدمی ہیں۔ اور آدمی آج کل کہاں روحوں کی آواز سنتے ہیں؟

تمک ہمارا ج بولے: تم جاؤ تو سہی اور دیکھو جلدی جاؤ۔ وہ پولس کا آدمی کہتا ہے کہ میں تم کو گرفتار نہ کرے۔ اور سنو اپنا بت کسی اچھی جگہ بنوانا۔ یہاں نہیں۔ میرے قدموں میں ریت ہے تپتی ہوئی اور سر آسمان اور دھوپ میں سر میں شدید درد ہونے لگتا ہے اور ساتھ سم دکنے لگتا ہے اور دن

بھر تماشا یوں کا نخل غل غل پڑ رہا تھا ہے۔ اندر بدتمیز لوگ وہی بڑے کی چاٹ کھلکا کر جھوٹے پتل میری طرف پھینکتے جاتے ہیں۔ کسی اچھی جگہ اپنا بت بنوانا۔
 لیکن وہ پر چھپائیں پولس کے ڈر سے غائب ہو چکی تھی۔ میں بھی جلدی سے اٹھ کر وہاں سے بھاگ آیا۔ بھاگتا بھاگتا چرچ گیٹ اسٹیشن تک آگیا یہاں اس کمر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اور چلتے چلتے ہاکی گراؤنڈ کے قریب آ نکلا اور یہاں ایک بڑے کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں مسیگر کا ڈون نے سنا کوئی کہہ رہا ہے۔

گو کھلے ہمارا ج۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ سامنے چبوترے پر گو کھلے ہمارا ج کا بت ہے۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ اور ایک آدمی کوٹ پتلون پہنے ہوئے اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب وہ چبوترے کے اوپر چڑھ گیا۔ اور آگے بڑھنے لگا تو گوپال کرشن گو کھلے کے بت نے پریشان ہو کے کہا۔
 تم آگے بڑھے تو میں پولس کو بلاؤں گا۔
 کیوں؟

میں قومی بت ہوں۔ تم میری بے حرمتی کر رہے ہو۔
 بے حرمتی نہیں دوست۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے آدمی نے جواب دیا میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔
 گو کھلے کا بت بولا۔ تو ذرا دور رہ کر تمیز سے بات کر۔ کون ہو تم؟
 کوٹ پتلون پہنے ہوئے شخص نے جواب دیا۔ میرا نام کرتار سنگھ مرہا

ہے۔
 گو کھلے بولا۔ سکھ اور پنجابی۔ جب ہی اس قدر بدتمیزی سے پیش آ رہے ہو۔ جانتے

نہیں ہو۔ میں امپیریل کونسل کا ممبر رہ چکا ہوں۔
 کرتار سنگھ نے کہا: دوست مجھے اسی حکومت کے حاکم اعلیٰ نے پھانسی کی سزا دی
 تھی جس کی کونسل کے تمام رکن رہ چکے ہو،
 گو کھلے نے کہا: اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے حتیٰ المقدور اپنی زندگی
 میں اپنے دیس کی سیوا کی ہے۔
 کرتار سنگھ نے کہا: کبھی جیل گئے ہو؟
 ”نہیں۔“

”کبھی بھوک ہڑتال کی ہے؟“

”نہیں۔“

”کبھی حبس خانوں اور دارڈروں سے پٹے ہو۔ حتیٰ کہ تمھاری پیٹھ زخموں سے مھلنی
 ہو گئی ہے۔ اور چابکوں کے ہتھیں لمس نے تمھارے گوشت کو قیمہ بنا دیا ہے،
 اور تمھارے جسم کا ذرہ ذرہ پانی مانگ رہا ہے۔ اور تمھاری زبان حلق سے باہر
 نکلی پڑتی ہے اور تمھیں کوئی ایک قطرہ پانی پینے کو نہیں دیتا۔“
 ”نہیں۔ اس قسم کا وحشیانہ تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا۔“

”اس لذت کی دائمی کیفیت سے میں آگاہ ہوں۔“ کرتار سنگھ بولا۔ اور اس نے
 اپنا کوٹ اتار پھینکا اور اپنی قمیص بھی۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ پر سے لہو بہہ
 رہا ہے۔ اور چابکوں کے نشان اندر رڑھ کی ہڈی تک چلے گئے ہیں۔ اور اس
 کے گتے میں ایک ساری ہے جسے اس نے ایک مانی کی طرح باندھ رکھا ہے۔
 ”یہ کیا ہے؟“ گو کھلے ہنساراج نے اپنی تاک پر رومال رکھتے ہوئے پوچھا
 ”یہ پھانسی کی رسی ہے۔ جسے میں اس جیکس گتے میں ڈالے ہوئے ہوں۔ اسی رسی
 نے میرا گلا گھونٹا تھا۔ اس وقت میں جوان تھا اور طاقت ور تھا۔ اور خوش تھا۔“

اور میں کھکتے سے لے کر میرے تہ اور ام تر سر فوجیوں میں گھومتا تھا تاکہ ان کو برطانوی حکومت سے بغاوت کے لئے آمادہ کروں۔

مگر کھٹے بولے: "تشدد اس میرے بغاوت میں اسکا نہیں میں تو جوانی تعاون میں یقین رکھتا ہوں۔"

کرنا سنگھ نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا: "لیکن ہماری بغاوت کا یہاں نہ رہی۔ ہماری تنظیم اچھی نہ تھی۔ ہمیں کچل کے رکھ دیا گیا۔ اور گولیوں کی بارش پر ہمارے جذبہ آزادی کو بھون کے رکھ دیا گیا۔"

مگر کھٹے بولے: "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

کرنا سنگھ نے کہا: "دو پارے سرک جاؤ۔ اس چوتھے پر مجھے تقویری سی جگہ دے دو۔ اس پر میرا بھی حق ہے۔ جانتے ہو پندرہ اگست کو جب تمہارے گلے میں بارود لے گئے تھے۔ میں بھی اس چوتھے کے پاس کھڑا تھا۔ کسی نے مجھے ہار نہیں پہنائے۔ کسی نے میری پھانسی کی رسی کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی نے میری پیٹھ کے رستے ہوئے زخموں کو نہیں دیکھا۔ کسی نے میرے جسم کو نہیں دیکھا جو بھوک ہڑتال کرتے کرتے سوکھ گیا۔ میری روح کو نہیں دیکھا جو ظالموں کے کورے کھاتے کھاتے بھی آزادی کے گیت گاتی رہی۔ میری ہمت کو نہیں دیکھا۔ جس نے آزادی کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اپنی جوانی کی ساری بہار بھی ساری آرزوئیں۔ ساری امنگیں۔ لوگوں نے تمہیں ہار پہنائے اور کسی نے میری طرف ایک پھول بھی نہیں پھینکا۔ دوست، میں نے وطن کی خاطر امپریل کونسل میں تقریریں نہیں کی ہیں۔ لیکن اپنے وطن کی خاطر موت کی رسی کو اپنے گلے سے ضرور باندھا ہے۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہاری عظمت کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن اب میں بہت بھنگ چکا۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پتھر کا بت

بن جانا چاہتا ہوں۔ بمٹھاری طرح۔ ذرا تھوڑی سی جگہ دے دو۔
گوکھلے ہمارا جیسے : بھئی میں مجبور ہوں۔ تمہیں جگہ نہیں دے سکتا ہے
پاس۔ کیونکہ میں تو جوابی تعاون میں یقین رکھتا ہوں اور تم تشدد و آمرانہ رویہ
ہمارا مسلک الگ الگ ہے۔ اور پھر تم کیوں نہیں میونسپل کارپوریشن کے
ہاں درخواست کرتے۔ وہاں چلے جاؤ ممکن ہے تمہارا کام ہو جائے۔ اور اگر ہو کر
تو دیکھو اور کہیں اس پاس میں اپنا بت نہ بنانا۔ میں اس جگہ سے خود بہت پریشان
ہو چکا ہوں۔ یہ قریب میں بڑا کا درخت ہے۔ یہاں سے پرندے میرے سر پر
بیٹھ کر تے ہیں۔ اور یوں تو لوگ کبھی اور کارخ نہیں کرتے۔ ہاں جب ہو کی
گراؤنڈ میں لڑکیوں کا میچ ہوتا ہے تو ان کی ننگی ٹانگیں دیکھنے کے لئے مجھے یوں
چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں کہ میرے لئے اپنی جگہ پر کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا ہے
اور رات کے بارہ بجے اس چبوترے کے بچوں پر طوائفوں اور تماش بینوں میں
دو چوم چائی ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے گوکھلے ہمارا ج کچھ نہ کہہ سکے کیونکہ پولس کا سپاہی گشت
کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اور کتا رنگہ سرا بھاؤ سے دیکھتے ہی بھاگ گیا تھا۔ میں اس کے
پیچھے بہت دُڑا۔ بہت بھاگا۔ مگر وہ اتنی تیزی سے آگے نکل گیا کہ میں اسے
پانہ سکا۔ دوڑتے دوڑتے جب میرا دم پھول گیا تو میں یکایک ٹھٹھک گیا۔ کیا
دیکھتا ہوں کہ ایک خوشنما پر نضا باغچہ سا ہے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر فرشتوں
کے بت پر پھیلائے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور ان کے پنج میں ایک بڑے چبوترے
پر دادا بھائی تو روحی کا عظیم بت پدرانہ شفقت سے مارے ہندوستان کو تک
رہا ہے۔

میں دیر تک ہندوستانی قومیت کے پدر علی کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں کسی نے

کہا : دادا بھائی ۔

میں نے پلٹ کر دیکھا : ایک لالہ بنے قد کا سیاہ رنگ کا آدمی تھا۔ وہ سفید قمیص اور خاک کی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹ بھی بند تھے۔ صرف اس کے ماتھے میں ایک سودا خ تھا۔ اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر آواز آئی : دادا بھائی ۔

یقیناً یہ وہی آدمی بول رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم اس کے ہونٹ نہ ہٹتے ہوئے بھی کس طرح بات کر رہے تھے۔

فوری جی بولے : کیا بات ہے بیٹا ۔

• دادا بھائی : " وہ لالہ آدمی بولا : " مل مجھ ہوں "۔

دادا بھائی نے بڑی شفقت سے پوچھا : یہاں بیٹی میں کس مل میں کام کرتے ہو ؟

• نہیں دادا بھائی۔ میں اہل نیر میں تمامیر نام پاٹل ہے۔ میرے تین بچے ہیں، ایک بڑھیا ماں ہے۔ ایک بڑھا باپ ہے۔ ان سب کا خرچہ میرے اوپر ہے اور میں یہ خرچہ اس تھوڑی سی مجھدی میں پورا نہیں اٹھا سکتا، میرے مالک۔

• تو تم کیا چاہتے ہو ؟ دادا بھائی بولے : " تنخواہ میں اضافہ "۔

• ہاں مالک، ہنگامی بہت ہے اور خرچہ زیادہ ہے۔ اور جلدی مصیبت ہے۔

• تو مل مالک سے کیوں نہیں کہتے ؟

• بہت کہا، مالک، انھوں نے نہیں سنا۔

• تو سرکار سے کہو۔ اپنی سرکار سے کہو۔ اب تو اپنی سرکار ہے۔

• اپنی سرکار نے بھی نہیں سنی۔ انھوں نے ہمیں گولی مار دی ہے۔ مالک یہ مانتے پر گولی کا نشان ہے میں اہل نیر کا مل مجھدی ہوں۔ میرے تین بچے ہیں، ایک

بیوی ہے۔ ایک بڈھی ماں ہے۔ ایک بڈھا باپ ہے۔ اور سب کا خرچہ مجھ پر ہے۔
 اور مجھے مار دیا گیا ہے۔ اور وہ سب لوگ بھوکے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ کانگریس
 کو چنہ دیا ہے۔ اور آجادی کے لئے ہڑتال بھی کی ہے۔ مگر آج آجادی آگئی ہے
 اور اس کی پہلی گولی میرے ماتھے پر ہے مالک۔
 تو تم کیا چاہتے ہو؟

کچھ نہیں مجھے اپنی چھتر چھایا میں تقوڑی سی جگہ دیدو۔ میں ساری دنیا کے سامنے
 کھڑا ہوں کہ تمہارے بھیک کھڑا ہوں کہ اپنے ماتھے کا لال نشان دکھانا چاہتا
 ہوں۔ دادا بھائی کی میرے ماتھے کا خون کبھی بند نہ ہوگا۔ میرے بڈھے باپ
 کو کوئی روٹی نہ دے گا۔ میری بیوی کو کوئی عزت نہ دے گا۔ میری بیوی کو کوئی
 عزت نہ دے گا۔ میری ماں کی ممتا کیا سدا پیاسی رہے گی۔ دادا بھائی بولو۔ دادا
 بھائی بولو۔ تم تو پارلیمنٹ میں شیر کی طرح گرجتے تھے۔ اب چپ کیوں ہو؟
 میری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور میں آگے کچھ نہ سن سکا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔
 اور روتے روتے اے آئی سی سی پنڈال کے باہر پہنچ گیا۔ جہاں ہمارا
 گاندھی کا بت کھڑا تھا۔ اے آئی سی سی کا اجلاس ختم ہو گیا تھا۔ اور تماشاخی شخصیت
 ہو گئے تھے۔ اور اب پنڈال توڑا جا رہا تھا۔ اور لائے لائے ہنس لاریوں
 میں بھر بھر کر پس لے جائے جا رہے تھے۔ میں بت کے پاس چلا گیا۔ اور
 رندے ہوئے گلے سے بولا

باپو، دیکھ تو یہی۔ تیرے راج میں کتنا اندھیرا ہے لنگوٹی والے باپو۔ آ۔
 میں تجھے دکھاؤں کہ تیرے فدائی تیرے نام پر کیا کر رہے ہیں۔
 لیکن بت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ انا دس کی رات ختم ہو چکی تھی،
 اور سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اور جب روشنی ہو جاتی ہے تو بت نہیں بولتے

مسی کے پاس ایک مزدور کھڑا تھا۔ وہ بولا: اس چپوترے سے پرے ہٹ جاؤ
 اس بت کو یہاں سے اٹھانا ہے۔
 کہان: "میں نے پوچھا
 وہ بولا: اسے ایک مل مالک نے خریدا ہے۔ یہ بت آج اس کے گھر آٹھ
 جائے گا۔

مرنے والے ساتھی کی مسکراہٹ

ساتھی بھارودواج سے میری ملاقات ۱۹۳۷ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ ان دنوں بھی پارٹی خلافت قانون قرار دی گئی تھی۔ اور پارٹی کے ساتھی "زیر زمین" چلے گئے تھے۔ بھارودواج کا رنگ سانولا۔ قد چھوٹا اور جسم دبلا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس مشت فاک کے اندر کتنی آگ چھپی ہوئی ہے اور یہ جسم اتنی محنت و مشقت کر سکتا ہے۔ اپنے اوپر اتنی مصیبتیں بھیل سکتا ہے۔ جو ایک قومی اندیشہ تراکی کا رکن کو اپنی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں۔

میں ان دنوں لاکھ میں پڑھتا تھا اور ذہنی اعتبار سے اتنا عقائد پرست نہیں

تھا، جتنا شخصیت پرست، بھارودراج کی شخصیت مجھے ذرا بھی متاثر نہ کر سکی
 ان دنوں پنجاب میں کانگریس کے اندر اتفاق و افتراق کا دور دورہ تھا۔ اور نوجوان
 طبقہ اس کے سیاسی انتشار اور جمہور سے عاجز اس کے کانگریس سوشلسٹ پارٹی
 کی طرف رجوع کر رہا تھا۔ اشتراکیوں کا نعرہ تھا، پاپور فرنٹ اپنا پنچہ ان دنوں کانگریس
 سوشلسٹ پارٹی میں اشتراکی اور کمیونسٹ ریڈیکل ڈیوکرٹیک پارٹی کے ممبر
 اور پرانی اندر پارٹی کے رکن اور نوجوان بھارت بھاکے جوشیلے ساتھی اور مزاحی
 دہشت پسند بھی پائے جاتے تھے۔ یہ متحدہ محاذ متحد ضرور تھا، پرانے کانگریسیوں
 کے خلاف، لیکن محاذ نہیں تھا۔ دن رات بریڈ لال میں جلے ہوئے اندساتھیوں
 کی مشاورتی مجلس میں کسی عملی پروگرام پر غور و خوض کرنے کے بجائے یہ بحث چھڑ
 جاتی کہ فلاں آدمی سی آئی ڈی کا ہے کہ نہیں۔ میں نے پورے ایک سال یہ
 مینٹگیں دیکھی ہیں جن میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ چند ساتھیوں پر سی
 آئی ڈی کے ارکان ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اور اس کے جواب میں انہوں نے
 دوسرے ساتھیوں پر الزام لگائے اور پورے ایک سال میں اس متحدہ محاذ پر اس
 کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوا۔ اور وہ بھی آخر میں یہ کوئی طے نہ کر سکا کہ کون سی سی آئی
 ڈی میں ہے اور کون نہیں ہے۔

ان ہی ہنگامی دنوں کہ جب پنجاب کے نوجوانوں میں تشدد آمیز بغاوت کا ایک
 عام جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے سامنے کوئی راہ ستیقم نہ دیکھ کر کبھی مزاحیت
 کی طرف جھکتے تھے، کبھی دہشت پسندی کے لئے تیار ہو جاتے۔ کبھی اشتراکیوں
 میں شامل ہوتے، کبھی کمیونسٹوں میں گھسنے کی کوشش کرتے تو کبھی ریڈیکل ڈیوکرٹیک
 پارٹی کے پٹے میں ٹانگ اٹاتے۔ اپنی دنوں میں میری ملاقات مرحوم بھارودراج
 سے ہوئی۔ ان کی آمد لاہور میں بالکل خفیہ رکھی گئی۔ صرف چند لوگوں ہی کو

ہوئی۔ اس میں ساتھی بھاروداج بھی شریک ہوئے اور میں نے یہیں پہلی بار
 انہیں دیکھا۔ مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا تھا۔ وہ یہاں پارٹی کی
 تشکیل کے سلسلے میں آئے ہیں۔ بڑے اونچے پائے کے لیڈر ہیں۔ سائے
 بندستان کا زیر زمین دورہ کر رہے ہیں۔ انہیں آج تک کوئی گرفتار نہیں
 کر سکا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں تو بھاری بھر کم اور توندیل لیڈروں سے متاثر ہوتا
 تھا۔ اس نے بھاروداج کی شخصیت کا کوئی اچھا اثر میں نہ لے سکا۔ خیر یہ تو پہلی
 نظر کی بات تھی۔ تعارف کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ اور وہی سی سی آئی ڈی کا
 مسئلہ پیش ہوا۔ اب بھاروداج نے جو ساتھیوں کو آڑے یا ہے تو میں دیکھتا ہی رہ
 گیا۔ جیسے بھاروداج کی زبان سے آتشیں چابک نکل رہے تھے اور قمیوں کی
 طرح ساتھیوں کے الزامات پر پڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں شعلے ناپ چ رہے تھے
 اور ان کا سارا پہرہ تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ وہ بھاروداج ہی نہ تھا جو ابھی دو منٹ
 پہلے تعارف کے وقت سب سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ ہمدی اس مجلس
 میں فراست و ذہانت کے دیوبھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے بے شمار
 دلائل و دے کر بھاروداج کو مرعوب کرنا چاہا۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اس لئے اُن
 کی پیش نہ گئی۔ اور بھاروداج نے پہلے تو طرزیہ انداز میں اس قومی مسئلے کو سلجھایا
 جو پنجاب کی اشتراکی سیاست کا جزو عظیم تھا۔ یعنی کون کارکن خفیہ پولیس سے
 تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد تیزابی لہجے میں اس کی صحیح اہمیت بتائی۔ اور
 بتایا کہ اگر یہ بڑا مسئلہ فی الحال نہ حل ہو سکتا ہو تو کیا ممکن نہیں کہ چھوٹے چھوٹے
 مسئلے ہی حل کر لئے جائیں۔ مزدوروں اور کسانوں میں بھی کام کیا جاسکتا ہے اور
 طالب علموں میں بھی۔ اور نراجی و ہشت پسندی سے الگ رہ کر ایک منظم جماعت
 کی تشکیل کی جاسکتی ہے جو طلباء کی بہبودی کے لئے کام کر سکے۔ پھر انہوں نے

بورڈ وائٹومی انقلاب اور اشتراکی انقلاب کے مارج بیان کئے اور میں اس قبلے
پتلے منحنی سے آدمی کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ فراست کے پتلوں نے
بھار دواج کے دلائل کو کئی بار قطع کرنا چاہا لیکن ہر بار منہ کی کھانا پڑی۔ پھر بات کا
رخ فیکشنل ازم اور فریکشنل ازم کے نازک تضاد کی طرف مڑ گیا۔ پھر حسد
باتیں طے ہو گئیں۔ جو اس سے پہلے ہم لوگ میسجوں بار مشابہت کر کے بھی نہ طے
کر سکے تھے۔ ان نکات کو کاغذ کے پرزوں پر لکھا گیا۔ اور پھر سب لوگ ان پر دستخط
کرنے لگے۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔
سب لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔

کون ہے

پولس ہے۔ دروازہ کھولو

پولس!

مکرمے میں اندھیرا تھا۔ پھر جیسے اندھیرا اند بڑھ گیا۔ مکرمے کا ایک
دروازہ لائبریری کی طرف کھلتا تھا۔ اندھیر بھی پولس تھی۔ ایک دروازہ لالہ احیت نام
کے مکرمے کی طرف تھا وہاں بھی پولس تھی۔ اور کا مریڈ بھار دواج کو ہر حالت میں
پولس کے ہاتھوں سے بچا نہ تھا۔ یکایک چند ساتھیوں نے کرسیاں اٹھا کر
ہاتھوں میں لے لیں۔ بھار دواج نے فوراً اٹھ کر جلدی جلدی کاغذ کے
پرزوں کو پھاڑا اور انہیں ننگت کیا۔ وہ تصویر اب بھی میرے سامنے ہے۔ وہ میز
کے کونے پر کھڑا کاغذ پھاڑ پھاڑ کر جلدی جلدی ننگل رہا تھا۔ ہم لوگ کرسیاں اٹھا

اٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ پولس دروازہ توڑ رہی تھی۔ اور بھارودواج کو بچانے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ یکا یک بھارودواج نے پھپھی طرف کی کھڑکی کھولی اور نیچے کی طرف دیکھا۔ دو منزل نیچے کی طرف، جہاں ایک نئے فلیٹ کی دیواریں اٹھانی جا رہی تھیں۔ یہ دیواریں نصف منزل تک آ چکی تھیں۔ بھارودواج نے کھڑکی میں بیٹھ کر ٹانگیں دوسری طرف لٹکا کر کہا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں! کیا کہتے ہو۔ مریاؤ گے۔ ایک ساتھی نے کہا۔

میں نہیں مردوں گا، چھلانگ لگا کر ان دیواروں پر کود جاؤں گا۔ اور وہاں سے چھلانگ لگا کر وہ نیچے صحن میں جہاں کمی آدمی کا گھر ہے۔ پھر دیکھیں گے۔ پھر کا مرید بھارودواج نے میری طرف دیکھا تم بھی چلے آؤ۔ تم اس مجلس میں پہلی بار شریک ہوئے ہو پولس کو تمھارا پتہ نہیں چلتا چاہئے۔ میں نے نیچے، دو منزل نیچے کی طرف ٹائف ہو کر دیکھا۔ بھارودواج نے چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ آؤ! اور وہ نیچے کود گیا۔ میں فوراً اس کے بعد کود گیا۔

ہمارے پاؤں نصف تعمیر شدہ دیواروں سے ٹکرائے۔ پھر وہاں سے اچھل کر ہم لوگ نیچے صحن میں جا پڑے۔ دوسری منزل نیچے۔ یہاں صحن میں ایک عورت سو رہی تھی۔ وہ جاگ گئی۔ ہمیں دیکھ کے اس کی گھٹکی بندھ گئی میں اس کے گھٹے کی حرکات سے دیکھ رہا تھا کہ وہ چھینا چاہتی ہے مگر ڈر کے مارے نہیں جھنجھکتی ہم جلدی سے صحن کو چھوڑ کے اندر گئے۔ سامنے کمرے میں مشور کا نگر س نیتا دیودراج سیٹھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے آپ کیسے آئے۔ باہر سے تو دروازہ بند ہے پولس نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

ہم نے کہا۔ ہم اوپر سے آئے ہیں۔ ادب خیریت۔ امداد باہر نکلتا چاہتے ہیں۔

دیوار ج سیٹھی بہت دیر تک سوچتے رہے۔ یہی کوئی دیر چار منٹ بھر ہوئے۔ ایک راستہ ہے اس سے آپ باہر کے آخری دروازے تک تو پہنچ جائیں گے۔ لیکن وہاں بھی شاید آپ کو پولس ملے گی۔

میں نے کہا۔ تو ہمیں رک جائیں
بھارودوار ج نے کہا۔ نہیں یہ غلط ہے اس سے ان پر آ پانچ آئے گی۔ اور پھر یہ نامناسب ہے۔ پھر سیٹھی صاحب کی طرف مڑ کے کہا۔ آپ وہ راستہ بتائیے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے ہمیں راستہ بتایا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ سب طرف خیریت تھی، اور آگے بڑھے تو پھر بڑا گیٹ دکھائی دیا۔ پچھوڑے کا گیٹ۔ یہاں پر پولس کا صرف ایک سپاہی کھڑا تھا بھارودوار ج نے کہا اپنے ہاتھ پتلون کی جیب میں اس طرح ڈال دو۔ گویا تم پستول کو ہاتھ میں تھا مے پتلون میں ڈالے چل رہے ہو اگر ہم بچ گئے تو بچ گئے ورنہ کوئی اور تدبیر لائیں گے۔ امداد ہاں دیکھو بڑے آرام سے آہستہ آہستہ چلو۔

ہم لوگ خراماں خراماں پتلون میں اطمینان سے ہاتھ ڈالے گیٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں پولس کے سپاہی نے ہمیں گھورد کے دیکھا۔ ہم نے اسے گھورد کے دیکھا۔ بھارودوار ج نے پولس کے آدمی کے سامنے پتلون میں پٹے ہوئے ہاتھ کو جنبش دی۔ پولس کا آدمی کانپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ہم

لوگ باہر نکل گئے۔ خراماں خراماں اس کے موڑ تک گئے۔ یہاں بھار دواں جانے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ اب میں اکیلا چلا جاؤں گا۔

میں نے پوچھا۔ اکیلے چلے جاؤ گے۔

وہ مسکرایا۔ بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ میں سارے راستے جانتا ہوں اکیلا ہی جاؤں گا۔ مجھے قید کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے سہی سہی۔ ہم تو ایک خیال کے ہمارے اڑتے ہیں اور اڑنے والے کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ پھر مسکرایا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔ اور موڑ پر غائب ہو گیا۔

اس کے بعد میں بھار دواں سے کبھی نہیں ملا۔ اس کے بعد سیری زندگی میں کوئی موڑ آئے، ملک کی سیاست نے بھی کوئی رنگ بدھے۔ بھار دواں کی پارٹی جس کا وہ رکن تھا ملک کی اہم ترین سیاسی جماعتوں میں شمار ہونے لگی، پھر میں نے سنا کہ بھار دواں کو تپ دق ہو گئی۔ شعلے نے جلا جلا کر اپنے آپ کو خاکستر کر دیا۔ اس کا کھڑو جسم شاید اس بھرتی ہوئی آگ کی حدت برداشت نہ کر سکتا تھا جو اس کی رگ و پے میں رواں دواں تھی، جو اسے ہندوستان کے چاروں کھونٹوں میں گھمائے پھرتی تھی۔ جس نے اسے دو منزلہ عمارت سے پھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اسے بھوکا پیاسا بدر شو کریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اس سے اپنا گھر بار، دوست احباب، رشتے و اقارب چھڑا دیئے تھے۔ سارا ہندوستان ایک جنگل تھا اور فرنگی ساحر احمیت کے شکاری اپنی بند قیں اٹھائے اس کی تلاش میں اس کے پیچھے بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔

بھار دواں کو تپ دق ہو گئی اور میں یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ

آگ کو تپ دق کیوں کر ہو سکتی ہے۔ یہاں کیسے جامد و ساکت رہ سکتا ہے۔ پھر
 ہوئے طوفان کے بند کون باندھ سکتا ہے۔ بھار دواج تپ دق کے بستر پر
 کیسے لیٹا ہے۔ کبھی کبھی میں یوہتی سوچتا تو لا بچیت رائے بھون کے مٹھ پر اس
 کا چہرہ مجھے دکھائی دے جاتا۔ اندر اس کی عجیب سی مسکراہٹ اور مسکرا کر اس
 کا مصافحہ کرنا۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ میں سب راستے جانتا ہوں۔

آج بھار دواج ہم میں نہیں ہے۔ وہ اکیلا چلا گیا ہے۔ اچھ گودہ سب
 راستے جانتا تھا۔ لیکن وہ اپنے راستے ہی پر گیا ہے۔ اندر کوئی اسے دوسرے
 راستے میں نہیں چلا سکا اور کوئی اسے قید نہ کر سکا۔ اور تپ دق کا عارضہ بھی
 اس کی جان نہ لے سکا۔ اس کی موت کے واقعات سب لوگ جانتے ہیں
 پھر بھی میں انہیں یہاں دہرانا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میرے لئے یہ واقعات
 ایک عجیب سی اہمیت رکھتے ہیں۔

پندرہ اگست کی آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں ۳۴ اپریل کے روز حکومت
 کے کارکنوں نے گرفتار کرنا چاہا۔ بھار دواج اس وقت تپ دق کے بستر پر خون
 اگل رہا تھا۔ اسے ۱۰ مہینے کا شدید بخار تھا۔ وہ کئی سالوں سے اپنے انتھک
 عملی کاموں کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ کیونکہ کھانسی نے اس کے پیچھے پھرے چھلنی کر دیے
 تھے۔ شمع بدستور روشن تھی لیکن فانوس کے پرزے پرزے ہو گئے تھے۔ یہ سچ
 ہے کہ اگر وہ میری طرح آرام کی زندگی بسر کرتا۔ اچھا کھاتا پیتا۔ میسر کرتا۔ بیوی بچوں میں
 رہتا، آرام و سائش کو مقدم رکھتا، تو شاید اسے تپ دق نہ ہوتی۔ وہ یوں خون
 نہ اگلتا۔ کھانسی سے اس کے پیچھے پھرے چھلنی نہ ہو جاتے۔ اندر یہ بھی سچ ہے کہ اگر وہ
 اپنے مسلک پر قائم نہ رہتا۔ اسی طرح مزدوروں اور کسانوں کے راج کے خواب نہ

دیکھتا۔ جو وہ پندرہ اگست کی آزادی سے پہلے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اگر وہ ہندوستان کے چند لاکھ سرمایہ پرستوں کا خیال کرتے ہوئے اس ملک کے کرپٹروں بد نصیب باشندوں کی حمایت کا خیال نہ کرتا تو آج پھر پوس اُسے یوں گرفتار کرنے نہ آتی جس طرح آج سے دس سال پہلے وہ اسے لاجپت رائے بھون میں گرفتار کرنے آئی تھی۔

مگر آج اس کے لئے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دروازے سارے کھلے تھے اور کھڑکیاں بھی، پھر بھی اس کے لئے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اور جب وہ لوگ اُسے گرفتار کرنے کے لئے آئے تو وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور گو اسے ۱۰۴ درجے کا بخار تھا۔ اور وہ خون اُگل رہا تھا۔ پھر بھی وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور کپڑے بدل کر چلتے پردہ مٹا دیے۔ اور جب وہ گھر سے چلا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ آج میں اس مسکراہٹ کو جان گیا ہوں کیونکہ میں نے اسے اس سے پہلے بھی دیکھا ہے۔ اور میں بھار دوا ج کی ماں سے کہنا چاہتا ہوں۔ اماں غم نہ کر۔ تیرا بیٹا مر گیا ہے۔ مگر میں وہ ایسی مسکراہٹ دے گیا ہے جو کبھی نہیں مر سکتی۔ جو کبھی نہیں مٹ سکتی۔ جو انسان کے غم کی طرح لازوال ہے اور تیری ماتا کی طرح ابدی ہے۔ یہ مسکراہٹ ہمیں آگے کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہ راستہ جو جیلوں، قیدوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سے گذرتا ہوا کسانوں اور ضروریوں کے راج کو جاتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بھی بھار دوا ج اسی راستے پر چل رہا تھا کہ جب ایک مشہور کانگریسی نیتا دیو راج سیٹھی نے اُسے بچا یا تھا اور آج بھی وہ اسی راستے پر چل رہا تھا کہ جب کانگریسی حکومت نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کا راستہ وہی تھا صرف کانگریس کا راستہ

بدل گیا تھا۔ لیکن بھارودراج کا راستہ وہی تھا۔ صرف پٹریاں بدل گئی تھیں، پہلے فرنگی کی پٹریاں تھیں آج کانگریس حکومت کی پٹریاں تھیں۔ اور وہ خون اگلتا ہوا، کھانستا ہوا، لیکن مسکاتا ہوا خراماں خراماں میٹریاں اتنا ہاتھ نہیں وہ پھر کسی دو منزلہ عمارت سے کود رہا تھا۔ وہ پھر اپنے گرفتار کرنے والوں کو جُل دے رہا تھا۔ اور اس کی سکراہٹ کہہ رہی تھی، میں اب جانتا ہوں وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی مجھے گرفتار کرنے والے دوستو، عرصے تک ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے آزادی کی خارزار منزل کی طرف آگے بڑھے ہیں۔ یہاں اس چھوٹے سے مرغزار میں چھوٹے سے بہتے ہوئے چشمے کو دیکھ کر تم رک گئے ہو۔ اور مجھے بھی آگے بڑھنے سے روک رہے ہو، مگر آزادی کا منبع تو بہت دور ہے اور مجھے آگے جانا ہے۔ اور تم مجھے روک نہ سکو گے، میں اپنا راستہ جانتا ہوں۔ میں وہ راستہ بھی خوب پہچانتا ہوں جس پر تم اب کا مزن ہو رہے ہو۔ یہ راستہ جو شروع میں بڑا خوشنما نظر آتا ہے، لیکن جس کی حد میں تباہی فطانتیت اور عوام دشمنی سے جا کر مل جاتی ہیں۔ اس رستے کو چھوڑ دو۔ اس رستے کو چھوڑ دو دوستو!

لیکن دوستوں نے اس رستے کو نہیں چھوڑا۔ اور بھارودراج کو جیل میں لے گئے جس کی عمارت پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہی ترنگا جسے ادبچاکر نے کے لئے بھارودراج نے اپنی زندگی کے بہترین سال، اپنی جوانی کے خوبصورت دن اپنی چاند کی راتیں، اپنے افکار کے بہترین لمحے صرف کر دیئے تھے۔

چار دن کے بعد کامرٹھ بھارودراج اسی جیل میں مر گیا۔ آخری لمحات میں اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنے ہاتھ کی مٹھی بند کی اور اسے ادبچاکر تے تھے

ملک کے مزدور اور کسانوں اور شب و روز محنت کرنے والے غریبوں کو سلام
 کیا اور مر گیا۔ اور میں سوچتا ہوں میں کیسے اس ہندوستان کا وفادار ہوں
 گا جس نے اُسے یوں مر جانے دیا۔ کیسے ان لوگوں کی عزت کر سکوں گا جنہوں
 نے اُسے بستر مرگ سے اٹھا کر جیل کی سلاخوں کے اندر بند کر دیا۔ کیسے ان کے
 گن گناؤں کا جنہوں نے اس کی لاش کے اوپر ترنگا بھنڈا لہرایا۔ یہ ہندوستان
 تو میرا نہیں ہے، یہ ہندوستان تو بھارودراج کے سپیوں کا نہیں ہے۔ یہ
 ہندوستان تو ان لاکھوں ان جانے بے نام سپاہیوں کا نہیں ہے۔ جنہوں نے
 ہنستے کھلتے آزادی کی راہ میں اپنی گردنیں کٹائی ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو پھر میں
 کیوں نہ اس مسکراہٹ کا وفادار بنوں جو مرتے ہوئے بھارودراج کے ہونٹوں
 پر کھیل رہی تھی، جو ابھی انسانیت کی اک نازک سی کٹی ہے۔ ایک تنہا راگیت
 ہے۔ اک نرم سی رد ہے۔ لیکن جو اک دن پھول کی طرح کھل جائے گی، نئے
 کی طرح گونجے گی۔ اور منہ بن کر چاروں طرف پھیل جائے گی۔

اجتناب سے آگے

صبح کو فی چھ بجے کا وقت ہو گا۔ لاری کا بھونپوڑے زور و شور سے چلایا۔
 دو تین منٹ تک چلاتا رہا۔ پھر چوکی دار مجھے بلانے کے لئے آیا میں مشکل تمام
 تیلد ہو کے اڈنگ آباد کے اس بوسیدہ مندرے کے پاس پہنچا جہاں لاری
 کھڑی تھی اور مسافر مجھے گایاں دے رہے تھے۔ اڈنگ آباد کے اس بوسیدہ
 مندرے پر کسی زمانے میں مشعلیں جلائی جاتی تھیں تاکہ شرک پر اجالار ہے، اس
 وقت یہ مندرہ لاریوں کے اڈے کا کام دیتا ہے۔ لاری بالکل مندرے کے ساتھ
 گھب کے کھڑی تھی۔ گہرے سایے میں، اس فاحشہ عورت کی طرح جو سنتری کی نگاہ
 سے پنج کے کسی اندھیریے کو نے میں خریدار کے انتظار میں کھڑی ہو۔ میں پہنچ گیا

جزیرے میں کھڑی کسی خیالی دنیا میں گم گم سب سے الگ بہت دور ہو کر مسکرا رہی
 تھی۔ میں نے اُسے دیکھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ بہت دودھ تھی۔ وہ مجھے سن
 نہ سکتی تھی میں اُسے سمجھانہ سکتا تھا۔ ہاں وہ مسکراہٹ گویا بار بار مجھے کہہ رہی تھی۔
 میں تبسم نہیں ہوں۔ میں تو ایک تنویر ہوں، اس نور صبح کی۔ اس نئی اجنتا کی
 جہاں بھی یہاں آئی نہیں۔ جو ابھی دودھ بہت دور ان گھومتے ہوئے مسیحاؤں
 اللہ کھیتوں سے پرے افق پر مسکرا رہی ہے۔

لاد می کے مسافر چپ ستے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ نعیم ہوئے
 ہوئے گنگنا نے لگا۔

۱۰ اک نگارِ آتش رخ سر کھلا۔

جانور

دیس راج ہاجن کوٹلی کارہنے والا ہے۔ کوٹلی کے شیر کے بازار میں اس کی سنار کی دکان ہوتی۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے جب میں کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اور گرمی کی چھٹیوں میں کوٹلی میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا۔ کوٹلی کا چھوٹا سا شہر میرپور اور پونچھ کے درمیان ایک پہاڑی سطح مرتفع پر آباد ہے۔ سطح مرتفع کے نیچے دیا بہتا ہے۔ چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ نیچے دیا تک جانے کے لئے پتھروں کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ راستے میں دو تین چھوٹے چھوٹے مند بھی ہیں۔ دن میں جب بھی دیکھئے عورتیں پانی کے برتن لئے سیڑھیوں پر آتی جاتی نظر آتی ہیں، اور نیچے دیا کا پانی نیلے پتھروں پر سے شور مچاتا ہوا گزرتا ہے اور بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا : میں اس کا علاج کر سکتا ہوں۔ مگر تم مجھے نہیں
 دو گے ؟

میں نے کہا : میسر اپس زرگی آنکھوں کا ہار ہے۔ دو جلی
 کان ہیں۔ اعد ایک پان کا پتہ ہے جس پر اوم لکھا ہوا ہے۔
 ڈاکٹر نے گھنٹی بجا کے کہا : مجھے تم کیونست معلوم ہوتے
 ابھی پولس کو بلانا ہوں۔